
منٹو
سڑک کے کنارے

سڑک
کے
کنارے

سعادت حسن منٹو

سڑک
کے
کنارے

○

نیا ادارہ • لاہور

بار اوّل
قیمت تین روپے
پبلشر: نیا ادارہ، لاہور
پرنٹر: سویرا آرٹ پریس، لاہور

یہ ننھے چراغ - یہ ننھے سردار
صرف اپنے لئے چمکتے ہیں -
جو کچھ یہ دیکھتے ہیں، جو کچھ یہ سُنتے ہیں
کسی کو نہیں بتاتے -

(چراغ ہائے سرِ راہ — میا تلف)

فہرس

شاداں

خان بہادر محمد اسلم خان کے گھر میں خوشیاں کھیلتی تھیں — اور صحیح معنوں میں کھیلتی تھیں۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں، ایک لڑکا۔ اگر بڑی لڑکی کی عمر تیرہ برس کی ہو گی تو چھوٹی کی بھی گیارہ ساڑھے گیارہ اور جو لڑکا تھا، گو سب سے چھوٹا مگر قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ اپنی بڑی بہنوں کے برابر معلوم ہوتا تھا۔

تینوں کی عمر جیسا کہ ظاہر ہے، اس دور سے گذر رہی تھی جب کہ ہر آس پاس کی چیز کھلونا معلوم ہوتی ہے۔ حادثے بھی یوں آتے ہیں، جیسے ربڑ کے اڑتے ہوئے غبارے۔ ان سے بھی کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔

خان بہادر محمد اسلم کا گھر خوشیوں کا گھر تھا — اس میں سب سے بڑی تین خوشیاں؛ اس کی اولاد تھیں۔ فریدہ، سعیدہ اور نجیب۔ یہ تینوں اسکول

جاتے تھے جیسے کھیل کے میدان میں جاتے ہیں ہنسی خوشی جاتے تھے ہنسی خوشی واپس آتے تھے اور امتحان یوں پاس کرتے تھے جیسے کھیل میں کوئی ایک دوسرے سے بازی لے جائے۔ کبھی فریدہ فرسٹ آتی تھی کبھی نجیب اور کبھی سعیدہ۔

خان بہادر محمد اسلم خان بچوں سے مطمئن، ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے انہوں نے محکمہ زراعت میں بتیس برس نوکری کی تھی۔ معمولی عہدہ سے بڑھتے بڑھتے وہ بلند ترین مقام پر پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے بڑی محنت کی تھی، دن رات دفتری کام کئے تھے —— اب وہ سستا رہے تھے۔ اپنے کمرے میں کتابیں لے کر پڑے رہتے اور ان کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ فریدہ، سعیدہ اور نجیب کبھی کبھی ماں کا کوئی پیغام لے کر آتے تو وہ اس کا جواب بھجوا دیتے۔

ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنا بستر وہیں اپنے کمرے میں لگوا لیا تھا۔ دن کی طرح ان کی رات بھی یہیں گذرتی تھی —— دنیا کے جھگڑے ٹنٹوں سے بالکل الگ۔ کبھی کبھی ان کی بیوی جو ادھیڑ عمر کی عورت تھی ان کے پاس آجاتی اور چاہتی کہ وہ اس سے دو گھڑی باتیں کریں مگر وہ جلد ہی اسے کسی بہانے سے ٹال دیتے۔ یہ بہانہ عام طور پر فریدہ اور سعیدہ کے جہیز کے متعلق ہوتا "جاؤ، یہ عمر چونچلے بگھارنے کی نہیں —— گھر میں دو جوان بیٹیاں ہیں، ان کے دان دہیج کی فکر کرو —— سونا دن بدن مہنگا ہو رہا ہے۔ دس بیس تولے خرید کر کیوں نہیں رکھ لیتیں —— وقت آئے گا تو پھر چیخو گی کہ ہائے اللہ، خالی زیوروں پر اتنا روپیہ

اٹھ رہا ہے"۔

یا پھر وہ کبھی اس سے یہ کہتے" فرخندہ خانم ـــ میری جان ہم بڈھے ہو چکے ہیں ــ تمہیں اب میری فکر اور مجھے تمہاری فکر ایک بچّے کی طرح کرنی چاہئے ـــ میری ساری پگڑیاں لیر لیر ہو چکی ہیں مگر تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ململ کے دو تھان ہی منگوا لو ـــ دو نہیں چار ـــ تمہارے اور بچیّوں کے دوپٹے بھی بن جائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم چاہتی کیا ہو؟ ـــ اور ہاں وہ میری مسواکیں ختم ہو گئی ہیں"۔

فرخندہ، خان بہادر کے پلنگ پر بیٹھ جاتی اور بڑے پیار سے کہتی" ساری دنیا برش استعمال کرتی ہے۔ آپ ابھی تک پرانی لکیر کے فقیر بنے ہیں"۔

خان بہادر کے لہجے میں نرمی آجاتی" نہیں فرخندہ جان ـــ یہ برش اور ٹوتھ پیسٹ سب واہیات چیزیں ہیں"۔

فرخندہ کے ادھیڑ چہرے پر لکیروں کی کوڑیاں اور مرلیاں سی بکھر جاتیں ـــ مگر صرف ایک لحظے کے لئے۔ خان بہادر اس کی طرف دیکھتے اور باہر صحن میں بچوں کی کھیل کود کا شور و غل سنتے ہوئے کہتے" فرخندہ ـــ تو کل ململ کے تھان آجائیں ـــ اور لٹھے کے بھی"۔ لیکن فوراً ہی معلوم نہیں کیوں اُن کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ جاتی اور وہ فرخندہ کو منع کر دیتے" نہیں نہیں، لٹھا منگوانے کی ابھی ضرورت نہیں ـــ!

باہر صحن میں بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے۔ سہ پہر کو شاداں عموماً ان کے ساتھ ہوتی۔ یہ گو نئی نئی آئی تھی، لیکن ان میں فوراً ہی گھل مل گئی تھی۔ سعیدہ اور فریدہ تو اس کے انتظار میں رہتی تھیں کہ وہ کب آتے اور سب مل کر "لُکن میٹی" یا "کھدو" کھیلیں۔

شاداں کے ماں باپ عیسائی تھے۔ مگر جب سے شاداں خان بہادر کے گھر میں داخل ہوئی تھی، فریدہ کی ماں نے اس کا اصلی نام بدل کر شاداں رکھ دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی اور اس کی بچیاں اس سے پیار کرنے لگی تھیں

شاداں جب صبح سویرے آتی تو فریدہ، سعیدہ اور نجیب اسکول جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوتے۔ وہ اس سے باتیں کرنا چاہتے، مگر ماں ان سے کہتی "بچو جلدی کرو — اسکول کا وقت ہو رہا ہے"۔

اور بچے جلدی جلدی تیاری سے فارغ ہو کر شاداں کو سلام کہتے ہوئے اسکول چلے جاتے۔

سہ پہر کے قریب شاداں جلدی جلدی محلے کے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر آجاتی اور فریدہ، سعیدہ اور نجیب کھیل میں مشغول ہو جاتے اور اتنا شور مچتا کہ بعض اوقات خان بہادر کو اپنے کمرے سے نوکر کے ذریعے سے کہلوانا پڑتا۔ کہ شور ذرا کم کیا جائے — یہ حکم سن کر شاداں سہم کر الگ ہو جاتی، مگر سعیدہ اور فریدہ اس سے کہتیں "کوئی بات نہیں شاداں — ہم اس سے بھی زیادہ شور مچائیں

تو وہ اب کچھ نہیں کہیں گے۔ ایک سے زیادہ بار وہ کوئی بات نہیں کہا کرتے"۔

اور کھیل پھر شروع ہو جاتا۔ کبھی لکن میٹی، کبھی کھدو اور کبھی لوڈو۔

لوڈو، شاداں کو بہت پسند تھی، اس لئے کہ یہ کھیل اس کے لئے نیا تھا۔ چنانچہ جب سے نجیب لوڈو لایا تھا، شاداں اسی کھیل پر مصر ہوتی۔ مگر فریدہ، سعیدہ اور نجیب تینوں کو یہ پسند نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوتا۔ بس وہ جو "چڑھو" سا ہوتا ہے، اس میں پانسہ ہلاتے اور پھینکتے رہو اور اپنی گوٹیں آگے پیچھے کرتے رہو۔

شاداں کھلی کھلی رنگت کی درمیانے قد کی لڑکی تھی۔ اس کی عمر فریدہ جتنی ہوگی مگر اس میں جوانی زیادہ نمایاں تھیں — جیسے خود جوانی نے اپنی شوخیوں پر لال پنسل کے نشان لگا دیے ہیں — محض شرارت کے لئے۔ ورنہ فریدہ اور سعیدہ میں وہ تمام رنگ، وہ تمام لکیریں، وہ تمام توسیں موجود تھیں جو اس عمر کی لڑکیوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن فریدہ، سعیدہ اور شاداں جب پاس پاس کھڑی ہوتیں تو تو شاداں کی جوانی زیرِ لب کچھ گنگناتی معلوم ہوتی۔

کھلی کھلی رنگت۔ پریشان بال اور دھڑکتا ہوا دوپٹہ جو کس کر اس نے اپنے سینے اور کمر کے اردگرد باندھا ہوتا۔ ایسی ناک، جس کے نتھنے گویا ہوا میں انجانی خوشبوئیں ڈھونڈنے کے لئے کانپ رہے ہیں۔ کان ایسے جو ذرا سی آہٹ پر چونک کر سننے کے لئے تیار ہوں۔

چہرے کے خط و خال میں کوئی خوبی نہیں تھی۔ اگر کوئی عیب گننے لگتا تو بڑی آسانی سے گن سکتا تھا، صرف اسی صورت میں اگر اس کا چہرہ اس کے جسم سے الگ کر کے رکھ دیا جاتا۔ مگر ایسا کیا جانا ناممکن تھا، اس لئے کہ اس کے چہرے اور اس کے بقایا جسم کا چولی دامن کا ساتھ تھا جس طرح چولی علیحدہ کرنے پر جسم کے آثار اس میں باقی رہ جاتے ہیں، اسی طرح اس کے چہرے پر بھی رہ جاتے اور اس کو پھر اُس کی سالمیت ہی میں دیکھنا پڑتا۔

شاداں بے حد پھرتیلی تھی۔ صبح آتی اور یوں منٹا منٹی میں اپنا کام ختم کر کے یہ جا وہ جا۔ سہ پہر کو آتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کود میں مصروف رہتی جب خان بہادر کی بیوی آخری بار چلّا کر کہتی "شاداں، اب خدا کے لئے کام تو کرو" تو وہ وہیں کھیل بند کر کے اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ ٹوکرہ اٹھاتی اور دو دو زینے ایک جست میں طے کرتی کوٹھے پہ پہنچ جاتی۔ وہاں سے فارغ ہو کر دھڑ دھڑ دھڑ نیچے اترتی اور صحن میں جھاڑو شروع کر دیتی۔

اس کے ہاتھ میں پھرتی اور صفائی دونوں چیزیں تھیں۔ خان بہادر اور اس کی بیوی فرخندہ کو صفائی کا بہت خیال تھا، لیکن مجال ہے جو شاداں نے کبھی ان کو شکایت کا موقع دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے کھیل کود پر معترض نہیں ہوتے تھے۔ یوں بھی وہ اس کو پیار کی نظروں سے دیکھتے تھے، روشن خیال تھے، اس لئے چھوت چھات ان کے نزدیک بالکل فضول تھی۔

شروع شروع میں تو خان بہادر کی بیوی نے اتنی اجازت دی تھی کہ اگر کچن میں اگر کوئی شاداں کو چھوئے تو لکڑی استعمال کرے، اور اگر وہ چھوئے تو بھی لکڑی کا کوئی ٹکڑہ استعمال کرے، لیکن کچھ دیر کے بعد یہ شرط ہٹا دی گئی اور شاداں سے کہا گیا کہ وہ آتے ہی صابن سے اپنا ہاتھ منہ دھولیا کرے۔

جب شاداں کی ماں کمانے کے لیے آتی تھی تو خان بہادر اپنے کمرے کی کسی چیز سے اس کو چھونے نہیں دیتے تھے، مگر شاداں کو اجازت تھی کہ وہ صفائی کے وقت چیزوں کی جھاڑ پونچھ بھی کر سکتی ہے۔

صبح، سب سے پہلے شاداں، خان بہادر کے کمرے کی صفائی کرتی تھی۔ وہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہوتے۔ شاداں ہاتھ میں برش لیے آتی تو ان سے کہتی "خان بہادر صاحب ـــــ ذرا برآمدے میں چلے جائیے!"

خان بہادر، اخبار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے شاداں فوراً ان کے پلنگ کے نیچے سے اُن کے سلیپر اٹھا کر ان کو پہنا دیتی اور وہ برآمدے میں چلے جاتے۔

جب کمرے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ ہو جاتی تو شاداں دروازے کی دہلیز کے پاس ہی سے کمر میں ذرا سا جھانکنے کا خم پیدا کر کے خان بہادر کو پکارتی "آجائیے خان بہادر صاحب"۔

خان بہادر صاحب اخبار اور سلیپر کھڑکھڑاتے اندر آجاتے ـــــ اور شاداں

دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتی۔

شاداں کو کام پر لگے، دو مہینے ہو گئے تھے۔ یہ گذرے تو خان بہادر کی بیوی نے ایک دن یوں محسوس کیا کہ شاداںؔ میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے اس نے سرسری سا غور کیا تو یہی بات ذہن میں آئی کہ محلے کے کسی نوجوان سے آنکھ لڑ گئی ہو گی۔

اب وہ زیادہ بن ٹھن کے رہتی تھی۔ اگر وہ پہلے کوری ململ تھی، تو اب ایسا لگتا تھا کہ اسے کلف لگا ہوا ہے ـــــ مگر یہ کلف بھی کچھ ایسا تھا جو ململ کے ساتھ انگلیوں میں چُنا نہیں گیا تھا۔

شاداںؔ دن بدن تبدیل ہو رہی تھی۔ پہلے وہ اُترن پہنتی تھی، پر اب اس کے بدن پر نئے جوڑے نظر آتے تھے ـــــ بڑے اچھے فیشن کے، بڑے عمدہ سلے ہوئے۔ ایک دن جب وہ سفید لٹھے کی شلوار اور پھولوں والی جارجٹ کی قمیص پہن کر آئی تو فریدہ کو باریک کپڑے کے نیچے سفید سفید گول چیزیں نظر آئیں۔

لکن میٹی ہو رہی تھی۔ شاداں نے دیوار کے ساتھ منہ لگا کر زور سے اپنی آنکھیں میچی ہوئی تھیں۔ فریدہ نے اس کی قمیص کے نیچے سفید سفید گول چیزیں دیکھی تھیں۔ وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ جب شاداںؔ نے پکارا "چھپ گئے" تو فریدہ نے سعیدہ کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے گئی اور دھڑکتے ہوئے

دل سے اس کے کان میں کہا: "سعیدہ — تم نے دیکھا، اس نے کیا پہنا ہُوا تھا؟"

سعیدہ نے پوچھا: "کس نے؟"

فریدہ نے اس کے کان ہی میں کہا: "شاداں نے؟"

"کیا پہنا ہوا تھا؟"

فریدہ کی جوابی سرگوشی سعیدہ کے کان میں غڑاپ سے غوطہ لگا گئی۔ جب ابھری تو سعیدہ نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا اور ایک بھنچی بھنچی حیرت کی "ہیں" اس کے لبوں سے خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر نکلی۔

دونو بہنیں کچھ دیر کھسر پھسر کرتی رہیں — اتنے میں دھماکا سا ہُوا اور شاداں نے ان کو ڈھونڈھ لیا — اس پر سعیدہ اور فریدہ کی طرف سے قاعدے کے مطابق چیخم دھاڑ ہونا چاہیئے تھی مگر وہ چُپ رہیں۔ شاداں کی خوشی کی مزید چیخیں اس کے حلق میں رک گئیں۔

فریدہ اور سعیدہ کمرے کے اندھیرے کونے میں کچھ سہمی سہمی سی کھڑی تھیں شاداں بھی قدرے خوفزدہ ہو گئی۔ ماحول کے مطابق اس نے اپنی آواز دبا کر اُن سے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

فریدہ نے سعیدہ کے کان میں کچھ کہا، سعیدہ نے فریدہ کے کان میں۔ دونوں نے ایک دوسری کو کہنیوں سے ٹھوکے دئے۔ آخر فریدہ نے کانپتے

ہوئے لہجے میں شاداں سے کہا "یہ تم نے . . . . یہ تم نے قمیص کے نیچے کیا پہن رکھا ہے!"

شاداں کے حلق سے ہنسی کے گول گول ٹکڑے نکلے۔

سعیدہ نے پوچھا "کہاں سے لی تو نے یہ؟"

شاداں نے جواب دیا "بازار سے"

فریدہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "کتنے میں؟"

"دس روپے میں!"

دونوں بہنیں ایک دم چلاتے چلاتے رک گئیں "اتنی مہنگی!"

شاداں نے صرف اتنا کہا "کیا ہم غریب دل کو اچھی لگنے والی چیزیں نہیں خرید سکتے؟"

اس بات نے فوراً ہی ساری بات ختم کر دی — تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد پھر کھیل شروع ہو گیا۔

کھیل جاری تھا۔ مگر کہاں جاری تھا، یہ خان بہادر کی بیوی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا — اب تو شاداں بڑھیا قسم کا تیل بالوں میں لگاتی تھی۔ پہلے ننگے پاؤں ہوتی تھی، پر اب اس کے پیروں میں اس نے سینڈل دیکھے۔

کھیل یقیناً جاری تھا — مگر خان بہادر کی بیوی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اگر کھیل جاری ہے، تو اس کی آواز شاداں کے جسم سے کیوں نہیں

آتی۔ ایسے کھیل بے آواز اور بے نشان تو نہیں ہوا کرتے۔ یہ کیسا کھیل ہے جو صرف کپڑے کا گز بنا ہوا ہے۔

اس نے کچھ دیر اس معاملے کے بارے میں سوچا، لیکن پھر سوچا کہ وہ کیوں بیکار میں مغز پاشی کرے۔ ایسی لڑکیاں خراب ہوا ہی کرتی ہیں اور کتنی داستانیں ہیں جو ان کی خرابیوں سے وابستہ ہیں اور شہر کے گلی کوچوں میں ان ہی کی طرح رُلتی پھرتی ہیں۔

دن گذرتے رہے اور کھیل جاری رہا۔

فریدہ کی ایک سہیلی کی شادی تھی۔ اس کی ماں خان بہادر کی بیوی کی منہ بولی بہن تھی۔ اس لئے سب کی شرکت لازمی تھی۔ گھر میں صرف خان بہادر تھے سردی کا موسم تھا۔ رات کو خان بہادر کی بیوی کو معاً خیال آیا کہ اپنی گرم شال منگوا لے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ نوکر کو بھیج دے مگر وہ ایسے صندوق میں پڑی تھی، جس میں زیورات بھی تھے، اس لئے اس نے نجیب کو ساتھ لیا اور اپنے گھر آئی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ بند ہوگا، چنانچہ اس نے دستک دی۔ جب کسی نے نہ کھولا تو نجیب نے دروازے کو ذرا سا دھکا دیا۔ وہ کھل گیا۔

اندر داخل ہو کر اس نے صندوق سے شال نکالی اور نجیب سے کہا۔ "جاؤ، دیکھو تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں۔ ان سے کہہ دینا کہ تم تو ابھی

تھوڑی دیر کے بعد لوٹ آؤ گے، لیکن ہم سب کل صبح آئیں گے — جاؤ بیٹا!"
صندوق میں چیزیں قرینے سے رکھ کر وہ تالا لگا رہی تھی کہ نجیب واپس آیا اور کہنے لگا۔ "ابا جی تو اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"
"اپنے کمرے میں نہیں ہیں؟ — اپنے کمرے میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں؟"
خان بہادر کی بیوی نے تالا بند کیا اور چابی اپنے بیگ میں ڈالی۔ "تم یہاں کھڑے رہو، میں ابھی آتی ہوں!"
یہ کہہ کر وہ اپنے شوہر کے کمرے میں گئی جو کہ خالی تھا مگر بتی جل رہی تھی بستر پر سے چادر غائب تھی۔ فرش دھلا ہوا تھا — ایک عجیب قسم کی بو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ خان بہادر کی بیوی چکرا گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے — پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھا، مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا — لیکن ایک چیز تھی۔ اس نے رینگ کر اسے پکڑا اور باہر نکل کر دیکھا — خان بہادر کی موٹی مسواک تھی.....
اتنے میں آہٹ ہوئی۔ خان بہادر کی بیوی نے مسواک چھپا لی — خان بہادر اندر داخل ہوئے اور ان کے ساتھ ہی مٹی کے تیل کی بو۔ ان کا رنگ زرد تھا جیسے سارا لہو نچڑ چکا ہے۔
کانپتی ہوئی آواز میں خان بہادر نے اپنی بیوی سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"
"کچھ نہیں — شال لینے آئی تھی — میں نے سوچا، آپ کو دیکھتی چلوں۔"

"جاؤ!"

خان بہادر کی بیوی چلی گئی —— چند قدم صحن میں چلی ہو گی کہ اسے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ وہ بہت دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھی رہی پھر نجیب کو لے کر چلی گئی۔

دوسرے روز فریدہ کی سہیلی کے گھر خان بہادر کی بیوی کو یہ خبر ملی کہ خان بہادر گرفتار ہو گئے ہیں —— جب اس نے پتا لیا تو معلوم ہوا کہ جرم بہت سنگین ہے۔ شاداں جب گھر پہنچی تو لہولہان تھی۔ وہاں پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کے ماں باپ اسے ہسپتال لے گئے۔ پولیس ساتھ تھی۔ شاداں کو وہاں ایک لحظے کے لئے ہوش آیا اور اس نے صرف "خان بہادر" کہا۔ اس کے بعد وہ ایسی بے ہوش ہوئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

جرم بہت سنگین تھا۔ تفتیش ہوئی۔ مقدمہ چلا —— استغاثے کے پاس کوئی عینی شہادت موجود نہیں تھی۔ ایک صرف شاداں کے لہو میں لتھڑے ہوئے کپڑے تھے اور وہ دو لفظ جو اس نے مرنے سے پہلے اپنے منہ سے ادا کئے تھے۔ —— لیکن اس کے باوجود استغاثے کو پختہ یقین تھا کہ مجرم خان بہادر ہے، کیونکہ ایک گواہ ایسا تھا جس نے شاداں کو شام کے وقت خان بہادر کے گھر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

صفائی کے گواہ صرف دو تھے۔ خان بہادر کی بیوی اور ایک ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے کہا کہ خان بہادر اس قابل ہی نہیں کہ وہ کسی عورت سے ایسا رشتہ قائم کرسکے۔ شاداں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ نابالغ تھی۔ اُس کی بیوی نے اس کی تصدیق کی۔

خان بہادر محمد اسلم خان بری ہو گئے ـــــ مقدمے میں انہیں بہت کوفت اٹھانی پڑی۔ بری ہو کر جب گھر آئے تو ان کی زندگی کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک صرف انہوں نے مسواک کا استعمال چھوڑ دیا۔

لتیکا رانی

وہ خوبصورت نہیں تھی۔ کوئی ایسی چیز اس کی شکل و صورت میں نہیں تھی جسے پُرکشش کہا جا سکے، لیکن اس کے باوجود جب وہ پہلی بار فلم کے پردے پر آئی تو اس نے لوگوں کے دل موہ لیے اور یہ لوگ جو اسے فلم کے پردے ہی پر بنی ٹھنی اداؤں کے ساتھ بڑے نرم و نازک رومانوں میں چھوٹی سی تتلی کے مانند اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھرکتے دیکھتے تھے، سمجھتے تھے کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اُس کے چہرے مہرے اور اس کے ناز نخرے میں ان کو ایسی کشش نظر آتی تھی کہ وہ گھنٹوں اس کی روشنی میں مبہوت مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔

اگر کسی سے پوچھا جاتا کہ تمہیں لتیکا رانی کے حسن و جمال میں کون سی سب سے

بڑی خصوصیت نظر آتی ہے جو اسے دوسری ایکٹرسوں سے جداگانہ حیثیت بخشتی ہے تو وہ بلا تامّل یہ کہتا کہ اس کا بھولپن۔ اور یہ واقعہ ہے کہ پردے پر وہ انتہا درجے کی بھولی دکھائی دیتی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس کے سوا کوئی اور خیال دماغ میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھولی ہے، بہت ہی بھولی۔ اور جن رومانوں کے پس منظر کے ساتھ وہ پیش ہوتی تھی ان کے تانے بانے یوں معلوم ہوتا تھا کسی جولاہے کی الھڑ لڑکی نے تیار کیے ہیں۔

وہ جب بھی پردے پر پیش ہوئی، ایک معمولی اَن پڑھ آدمی کی بیٹی کے روپ میں چمکیلی دنیا سے دور ایک شکستہ جھونپڑا ہی جس کی ساری دنیا تھی۔ کسی کسان کی بیٹی، کسی مزدور کی بیٹی، کسی کانٹا بدلنے والے کی بیٹی۔ اور وہ ان کرداروں کے خول میں یوں سما جاتی تھی جیسے گلاس میں پانی۔

لتیکا رانی کا نام آتے ہی آنکھوں کے سامنے، ٹخنوں سے بہت اونچا گھگھرا پہنے، کھینچ کر اوپر کی ہوئی ننھی منّی چوٹی والی، مختصر قد کی ایک چھوٹی سی لڑکی آجاتی تھی جو مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنانے یا بکری کے معصوم بچے کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہے۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، پھنسی پھنسی چولی میں بڑے شاعرانہ انکسار کے ساتھ سینے کا چھوٹا سا ابھار، معتدل آنکھیں، شریف سی ناک، اس کے سراپا میں یوں سمجھئے کہ دوشیزگی کا خلاصہ ہو گیا تھا جو ہر دیکھنے والے کی سمجھ میں آجاتا تھا پہلے فلم میں آتے ہی وہ مشہور ہو گئی اور اس کی یہ شہرت اب تک قائم ہے

حالانکہ اُسے فلمی دنیا چھوڑے ایک مدت ہو چکی ہے۔ اپنی فلمی زندگی کے دوران میں اس نے شہرت کے ساتھ دولت بھی پیدا کی۔ اس نپے تلے انداز میں گویا اس کو اپنی جیب میں آنے والی ہر پائی کی آمد کا علم تھا اور شہرت کے تمام زینے بھی اس نے اسی انداز میں طے کئے کہ ہر آنے والے زینے کی طرف اس کا قدم بڑے وثوق سے اٹھا ہوتا تھا۔

لتیکا رانی بہت بڑی ایکٹرس اور عجیب و غریب عورت تھی۔ اکیس برس کی عمر میں جب وہ فرانس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی تو اس نے فرانسیسی زبان کی بجائے ہندوستانی زبان سیکھنا شروع کر دی۔ اسکول میں ایک مدراسی نوجوان کو اس سے محبت ہو گئی تھی، اس سے شادی کرنے کا وہ پورا پورا فیصلہ کر چکی تھی لیکن جب لنڈن گئی تو اس کی ملاقات ایک ادھیڑ عمر کے بنگالی سے ہوئی جو وہاں بیرسٹری پاس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لتیکا نے اپنا ارادہ بدل دیا اور دل میں طے کر لیا کہ وہ اس سے شادی کرے گی اور یہ فیصلہ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔ اس نے بیرسٹری پاس کرنے والے ادھیڑ عمر کے بنگالی میں وہ آدمی دیکھا جو اس کے خوابوں کی تکمیل میں حصہ لے سکتا تھا۔ وہ مدراسی جس سے اس کو محبت تھی۔ جرمنی میں پھیپھڑوں کے امراض کی تشخیص و علاج میں مہارت حاصل کر رہا تھا۔ اس سے شادی کر کے زیادہ سے زیادہ اسے اپنے پھیپھڑوں کی اچھی دیکھ بھال کی ضمانت مل سکتی تھی، جو اسے درکار نہیں تھی۔ لیکن پر فلا ریائے

ایک خواب ساز تھا۔ ایسا خواب ساز جو بڑے دیرپا خواب بُن سکتا تھا اور لتیکا اس کے اردگرد اپنی نسوانیت کے بڑے مضبوط جالے تن سکتی تھی۔

پرفلا رائے ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ بہت محنتی، وہ چاہتا تو قانون کی بڑی سے بڑی ڈگری تمام طالب علموں سے ممتاز رہ کر حاصل کر سکتا تھا مگر اسے اس علم سے سخت نفرت تھی۔ صرف اپنے ماں باپ کو خوش رکھنے کی غرض سے وہ ڈنرز میں حاضری دیتا تھا اور تھوڑی دیر کتابوں کا مطالعہ بھی کر لیتا تھا۔ ورنہ اس کا دل و دماغ کسی اور ہی طرف لگا رہتا تھا۔ کس طرف؟ یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ دن رات وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ اس کو ہجوم سے سخت نفرت تھی، پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا سارا وقت قریب قریب تنہائی میں گزرتا کسی چائے خانے میں یا اپنی بوڑھی لینڈ لیڈی کے پاس بیٹھا وہ گھنٹوں ایسے قلعے بناتا رہتا جن کی بنیادیں ہوتی تھیں نہ فصیلیں۔ مگر اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس سے کوئی نہ کوئی عمارت ضرور بن جائے گی جس کو دیکھ کر وہ خوش ہوا کرے گا۔

لتیکا جب پرفلا رائے سے ملی تو چند ملاقاتوں ہی میں اس کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہ بیرسٹری کرنے والا بنگالی معمولی آدمی نہیں۔ دوسرے مرد اس سے دلچسپی لیتے رہے تھے، اس لئے کہ وہ جوان تھی، ان میں سے اکثر نے اس کے حُسن کی تعریف کی تھی، لیکن مدت ہوئی وہ اس کا فیصلہ اپنے خلاف کر چکی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ ان کی تعریف محض رسمی ہے۔ مدراسی ڈاکٹر جو اس سے واقعی محبت کرتا تھا اس کو

صیحح معنوں میں خوبصورت سمجھا تھا مگر لتیکا سمجھتی تھی کہ وہ اس کی نہیں اس کے پھیپھڑوں کی تعریف کر رہا ہے جو اس کے کہنے کے مطابق بے داغ تھے۔ وہ ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل وصورت کی جس میں جاذبیت تھی نہ کشش، اس نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ وہ ادھوری سی ہے۔ اس میں بہت سی کمیاں ہیں جو پوری تو ہو سکتی ہیں مگر بڑی چھان بین کے بعد اور وہ بھی اس وقت جب اس کو خارجی امداد حاصل ہو۔

پر فلا رائے سے ملنے کے بعد لتیکا نے محسوس کیا تھا کہ وہ جو بظاہر سگرٹ پر سگرٹ پھونکتا رہتا ہے اور جس کا دماغ ایسا لگتا ہے، ہمیشہ غائب رہتا ہے اصل میں سگرٹوں کے پریشان دھوئیں میں اپنے دماغ کی غیر حاضری کے باوجود اس کی شکل وصورت کے تمام اجزا بکھیر کر ان کو اپنے طور پہ سنوارنے میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اس کے اندازِ تکلّم، اس کے ہونٹوں کی جنبش اور اس کی آنکھوں کی حرکت کو صرف اپنی نہیں دوسروں کی آنکھوں سے بھی دیکھتا ہے؛ پھر ان کو الٹ پلٹ کرتا ہے اور اپنے تصور میں تکلّم کا نیا انداز، ہونٹوں کی نئی جنبش اور آنکھوں کی نئی حرکت پیدا کرتا ہے۔ ایک خفیف سی تبدیلی پر وہ بڑے اہم نتائج کی بنیادیں کھڑی کرتا ہے اور دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔

لتیکا ذہین تھی۔ اس کو فوراً ہی معلوم ہو گیا تھا کہ پر فلا رائے ایسا معمار ہے جو اسے عمارت کا نقشہ بنا کر نہیں دکھائے گا۔ وہ اس سے یہ بھی نہیں کہے گا

کہ کون سی اینٹ اکھیڑ کر کہاں لگائی جائے گی تو عمارت کا سُقم دور ہوگا۔ چنانچہ اس نے اُس کے خیالات و افکار ہی سے سب ہدایتیں وصول کرنا شروع کر دی تھیں۔

پرفلا رائے نے بھی فوراً ہی محسوس کر دیا کہ للتیکا اس کے خیالات کا مطالعہ کرتی ہے اور ان پر عمل کرتی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اس خاموش درس و تدریس کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔

پرفلا رائے اور للتیکا دونوں مطمئن تھے، اس لئے کہ وہ دونوں لازم و ملزوم سے ہو گئے تھے۔ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل تھا۔ للتیکا کو خاص طور پر اپنی ذہنی و جسمانی کروٹ میں پرفلا کی خاموش تنقید کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ وہ اس کے ناز و ادا کی کسوٹی تھا، اس کی بظاہر خلا میں دیکھنے والی نگاہوں سے اس کو پتہ چل جاتا تھا کہ اس کی پلک کی کونسی نوک ٹیڑھی ہے۔ لیکن وہ اب یہ حقیقت معلوم کر چکی تھی کہ وہ حرارت جو اس کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں میں ہے، اس کی آغوش میں نہیں تھی۔ للتیکا کے لئے یہ بالکل ایسی تھی جیسی کھرّی چارپائی۔ لیکن وہ مطمئن تھی، اس لئے کہ اس کے خوابوں کے بال و پر نکالنے کے لئے پرفلا کی آنکھوں کی حرارت ہی کافی تھی۔

وہ بڑی سیاق دان اور اندازہ گیر عورت تھی۔ اس نے دو مہینے کے عرصے ہی میں حساب لگا لیا تھا کہ ایک برس کے اندر اندر اس کے خوابوں کی تکمیل کی

ابتدا ہو جائے گی ۔ کیونکر ہوگی اور کس فضا میں ہوگی۔ یہ سوچنا پرخلا رائے کا کام تھا اور لتیکا کو یقین تھا کہ اس کا سدا متحرک دماغ کوئی نہ کوئی راہ پیدا کرے گا۔

چنانچہ دونوں جب ہندوستان واپس جانے کے ارادے سے برلن کی سیر کو گئے اور پرخلا کا ایک دوست انہیں اوفا فلم اسٹوڈیوز میں لے گیا تو لتیکا نے پرو فلا کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں کی گہرائیوں میں اپنے مستقبل کی صاف جھلک دیکھ لی ۔ وہ ایک مشہور جرمن ایکٹرس سے محوِ گفتگو تھا مگر لتیکا محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کے سراپا کو کینوس کا ٹکڑا بنا کر ایکٹرس لتیکا کے نقش و نگار بنا رہا ہے۔

بمبئی پہنچے تو تاج محل ہوٹل میں پرخلا رائے کی ملاقات ایک انگریز نائٹ سے ہوئی جو قریب قریب قلاش تھا۔ مگر اس کی واقفیت کا دائرہ بہت وسیع تھا عمر ساٹھ سے کچھ اوپر، زبان میں لکنت ، عادات و اطوار بڑی شستہ ۔ پرخلا رائے اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ مگر لتیکا رانی کی اندازہ گیر طبیعت نے فوراً بھانپ لیا کہ اس سے بڑے مفید کام لیے جا سکتے ہیں، چنانچہ وہ نرس کی سی توجہ اور خلوص کے ساتھ اس سے ملنے جلنے لگی اور جیسا کہ لتیکا کو معلوم تھا ایک دن ڈنر پر ایک طرح خود بخود طے ہو گیا کہ اس فلم کمپنی میں جو پرخلا رائے قائم کرے گا۔ وہ دو مہمان جو سر ہاورڈ پیکل نے مدعو کیے تھے ڈائرکٹر ہوں گے اور چند دن کے اندر اندر وہ تمام مراحل طے ہو گئے جو ایک لمیٹڈ کمپنی کی بنیادیں کھڑی کرنے میں درپیش آتے ہیں۔

سر ہاورڈ بہت کام کا آدمی ثابت ہوا، یہ پرفلا کا ردِ عمل تھا، لیکن لتیکا شروع ہی سے جانتی تھی کہ وہ ایسا آدمی ہے جس کی افادیت بہت جلد پردۂ ظہور پر آجائے گی۔ وہ جب اس کی خدمت گذاری میں کچھ وقت صرف کرتی تھی تو پرفلا حسد محسوس کرتا تھا، مگر لتیکا نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قربت سے بڈھا سر ہاورڈ ایک گونہ جنسی تسکین حاصل کرتا تھا، مگر وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ یوں تو وہ دو مالدار مہمان بھی اصل میں اسی کی وجہ سے اپنا سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہوئے تھے اور لتیکا کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ لوگ صرف اسی وقت تک اہم تھے جب تک، ان کا سرمایہ ان کی تجوریوں میں تھا، وہ ان دونوں کا تصور بڑی آسانی سے کر سکتی تھی جب یہ مارواڑی سیٹھ اسٹڈیوز میں اس کی ہلکی سی جھلک دیکھنے کے لیے بھی ترسا کریں گے لیکن یہ دن قریب لانے کے لئے اس کو کوئی عجلت نہیں تھی، ہر چیز اس کے حساب کے مطابق اپنے وقت پر ٹھیک ہو رہی تھی لمیٹڈ کمپنی کا قیام عمل میں آگیا۔ اس کے سارے حصے بھی فروخت ہو گئے۔ سر ہاورڈ ہیبکل کے وسیع تعلقات اور اثر و رسوخ کی وجہ سے ایک پر فضا مقام پر اسٹڈیو کے لئے زمین کا ٹکڑا بھی مل گیا۔ اِدھر سے فراغت ہوئی تو ڈائرکٹرول نے پرفلا رائے سے درخواست کی کہ وہ انگلینڈ جا کر ضروری ساز و سامان خرید لائے۔

انگلینڈ جانے سے ایک روز پہلے پرفلا نے ٹھیٹ یورپی انداز میں لتیکا سے شادی کی درخواست کی جو اس نے فوراً منظور کر لی۔ چنانچہ اسی دن ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

دونوں انگلینڈ گئے۔ ہنی مون میں دونوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایک دوسرے کے جسم کے متعلق جو انکشافات ہونے تھے۔ وہ عرصہ ہوا ان پر ہو چکے تھے، ان کو اب دھن صرف اس بات کی تھی کہ وہ کمپنی جو انہوں نے قائم کی ہے اس کے لئے مشینری خریدیں اور واپس بمبئی میں جا کر کام پر لگ جائیں۔

لتیکا نے کبھی اس کے متعلق نہ سوچا تھا کہ پرفلا جو فلم سازی سے قطعاً ناواقف ہے۔ اسٹڈیو کیسے چلائے گا۔ اس کو اس کی ذہانت کا علم تھا۔ جس طرح اس نے خاموشی ہی خاموشی میں صرف اپنی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں سے اس کی نوک پلک درست کر دی تھی۔ اسی طرح اس کو یقین تھا کہ وہ فلم سازی میں بھی کامیاب ہو گا۔ وہ اس کو جب اپنے پہلے فلم میں ہیروئن بنا کر پیش کرے گا تو ہندوستان میں ایک قیامت برپا ہو جائے گی۔

پرفلا رائے فلم سازی کی تکنیک سے قطعاً ناآشنا تھا۔ جرمنی میں صرف چند دن اس نے اوفا اسٹڈیوز میں اس صنعت کا سرسری مطالعہ کیا تھا لیکن جب وہ انگلینڈ سے اپنے ساتھ ایک کیمرہ مین اور ایک ڈائرکٹر لے کر آیا اور انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا پہلا فلم سیٹ پر گیا تو اسٹڈیوز کے سارے عملے پر اس کی

ذہانت اور قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ بہت کم گفتگو کرتا تھا۔ صبح سویرے اسٹڈیو آتا تھا اور سارا دن اپنے دفتر میں فلم کے مناظر اور مکالمے تیار کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ شوٹنگ کا ایک پروگرام مرتب تھا جس کے مطابق کام ہوتا تھا، ہر شعبے کا ایک نگران مقرر تھا جو پرفلا کی ہدایت کے مطابق چلتا تھا۔ اسٹڈیو میں ہر قسم کی آوارگی ممنوع تھی۔ بہت صاف ستھرا ماحول تھا جس میں ہر کام بڑے قرینے سے ہوتا تھا۔

پہلا فلم تیار ہو کر مارکیٹ میں آگیا۔ پرفلا رائے کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں نے جو کچھ دیکھنا چاہا تھا وہی پردے پر پیش ہوا۔ وہ زمانہ بھڑکیلے پن کا تھا۔ ہیروئن وہی سمجھی جاتی تھی جو زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہو، اونچی سوسائٹی سے متعلق ہو۔ ایسے رومانوں میں مبتلا ہو حقیقت سے جنہیں دور کا بھی واسطہ نہیں ایسی زبان بولے جو اسٹیج کے ڈراموں میں بولی جاتی ہے۔ لیکن پرفلا رائے کے پہلے فلم میں سب کچھ اس کا الٹ تھا۔ فلم بینوں کے لئے یہ تبدیلی، یہ اچانک انقلاب بڑا خوشگوار تھا، چنانچہ یہ ہندوستان میں ہر جگہ کامیاب ہوا اور لتیکا رانی نے عوام کے دل میں فوراً ہی اپنا مقام پیدا کرلیا۔

پرفلا رائے اس کامیابی پر بہت مطمئن تھا۔ وہ جب لتیکا کے معصوم حسن اور اس کی بھولی بھالی اداکاری کے متعلق اخباروں میں پڑھتا تھا تو اس کو اس خیال سے کہ وہ ان کا خالق ہے بہت راحت پہنچتی تھی۔ لیکن لتیکا پر اس

کامیابی نے کوئی نمایاں اثر نہیں کیا تھا۔ اس کی اندازہ گیر طبیعت کے لئے یہ کوئی غیر متوقع چیز نہیں تھی۔ وہ کامیابیاں جو مستقبل کی کوکھ میں چھپی ہوئی تھیں کھلی ہوئی کتاب کے اوراق کی مانند اس کے سامنے تھیں۔

پہلے فلم کی نمائش عظمیٰ پر وہ کیسے کپڑے پہن کر سینما ہال میں جائے گی۔ اپنے خاوند پر فلا رائے سے دوسروں کے سامنے کس قسم کی گفتگو کرے گی۔ جب اسے ہار پہنائے جائیں گے تو وہ انہیں اتار کر خوش کرنے کے لئے کس کے گلے میں ڈالے گی۔ اس کے ہونٹوں کا کون سا کونہ کس وقت پر کس انداز میں مسکرائے گا یہ سب اس نے ایک مہینہ پہلے سوچ لیا تھا۔

اسٹڈیو میں للیتکا کو ہر حرکت ہر ادا ایک خاص پلان کے ماتحت عمل میں آتی تھی، اس کا مکان پاس ہی تھا۔ سر ہاورڈ بیسیکل کو پر فلا رائے نے اسٹڈیو کے بالائی حصے میں جگہ دے رکھی تھی۔ للیتکا صبح سویرے آتی اور کچھ وقت سر ہاورڈ کے ساتھ گذارتی، جس کو باغبانی کا شوق تھا۔ نصف گھنٹے تک وہ اس بڈھے الکن نائٹ کے ساتھ پھولوں کے متعلق گفتگو کرتی رہتی۔ اس کے بعد گھر چلی جاتی اور اپنے خاوند سے اس کی ضروریات کے مطابق تھوڑا سا پیار کرتی۔ وہ اسٹڈیو چلا جاتا اور للیتکا اپنے سادہ میک اپ میں جس کا ایک ایک خط، ایک ایک نقطہ پر فلا کا بنایا ہوا تھا مصروف ہو جاتی۔

دوسرا فلم تیار ہوا، پھر تیسرا، اسی طرح پانچواں، یہ سب کامیاب ہوئے

لتنے کامیاب کہ دوسرے فلم سازوں کو انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے قائم کردہ خطوط پر بدرجہ مجبوری چلنا پڑا۔ اس نقل میں وہ کامیاب ہوئے یا ناکام، اس کے متعلق ہمیں کوئی سروکار نہیں ۔ للیتکا کی شہرت ہر نئے فلم کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ ہر جگہ انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا شہرہ تھا۔ مگر پرفلا رائے کو بہت کم آدمی جانتے تھے۔ وہ جو اس کا معمار تھا، وہ جو للیتکا کا نصف بہتر تھا۔ لیکن پرفلا نے کبھی اس کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا، اس کی خلا میں جھانکنے والی آنکھیں ہر وقت سگریٹ کے دھوئیں میں للیتکا کے نت نئے روپ بنانے میں مصروف رہتی تھیں ۔

ان فلموں میں ہیرو کو کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پرفلا رائے کے اشاروں پہ وہ کہانی میں اٹھتا، بیٹھتا اور چلتا تھا۔ اسٹڈیو میں بھی اس کی شخصیت معمولی تھی۔ سب جانتے تھے کہ پہلا نمبر مسٹر رائے کا اور دوسرا مسز رائے کا، جو باقی ہیں سب فضول ہیں۔ لیکن اس کا ردِ عمل یہ شروع ہوا کہ ہیرو نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ للیتکا کے ساتھ اس کا نام پردے پر لازم و ملزوم ہو گیا تھا، اس لئے اس سے اس نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ للیتکا سے اُسے دلی نفرت تھی، اس لئے کہ وہ اس کے حقوق کی پرواہ ہی نہیں کرتی تھی۔ اس کا اظہار بھی اس نے اب آہستہ آہستہ اسٹڈیو میں کرنا شروع کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اچانک پرفلا رائے نے اپنے آئندہ فلم میں اس کو شامل نہ کیا۔ اس پر چھوٹا سا ہنگامہ برپا ہوا لیکن

فوراً ہی دب گیا۔ نئے ہیرو کی آمد سے تھوڑی دیر اسٹڈیو میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں، لیکن یہ بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔

لتیکا اپنے شوہر کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھی، لیکن اس نے اسے تبدیل کرانے کی کوشش نہ کی، جو حساب اس نے لگایا تھا اس کے مطابق تازہ فلم ناکام ثابت ہوا۔ اس کے بعد دوسرا بھی۔ اور جیسا کہ لتیکا کو معلوم تھا، اس کی شہرت دبنے لگی اور ایک دن یہ سننے میں آیا کہ وہ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اخباروں میں ایک تھلکہ مچ گیا۔ لتیکا کا دامن حیرتناک طور پر رومانس وغیرہ سے پاک رہا تھا۔ لوگوں نے جب سنا کہ وہ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ تو اس کے عشق کی کہانیاں گھڑنی شروع کر دیں۔

پرفلا رائے کو بہت صدمہ ہوا جو اس کے قریب تھے ان کا بیان ہے کہ وہ کئی بار بے ہوش ہوا۔ لتیکا کا بھاگ جانا اس کی زندگی کا بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس کا وجود اس کے لئے کینوس کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر وہ اپنے خوابوں کی تصویرکشی کرتا تھا۔ اب ایسا ٹکڑا اسے اور کہیں سے دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ غم کے مارے وہ نڈھال ہو گیا اس نے کئی بار چاہا کہ اسٹڈیو کو آگ لگا دے اور اس میں خود کو جھونک دے۔ مگر اس کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت تھی جو اس میں نہیں تھی۔

آخر پرانا ہیرو آگے بڑھا اور اس نے معاملہ سلجھانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے لتیکا کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کئے کہ پرفلا بھونچکا رہ گیا۔ اس نے بتایا — ”لتیکا ایسی عورت ہے جو محبت کے لطیف

جذبے سے قطعاً محروم ہے۔ نئے ہیرو کے ساتھ وہ اس لئے نہیں بھاگی کہ اس کو اس سے عشق ہے۔ یہ محض اسٹنٹ ہے۔ ایک ایسی چال جس سے وہ اپنی تنزل پذیر شہرت کو تھوڑے عرصے کے لئے سنبھالا دینا چاہتی ہے اور اس میں اس نے اپنا شریک کار نئے ہیرو کو اس لئے بنایا ہے کہ وہ میری طرح خود سر نہیں وہ اس کو اس طرح اپنے ساتھ لے گئی ہے جس طرح کسی نوکر کو لے جاتے ہیں۔ اگر اس نے مجھے منتخب کیا ہوتا تو اس کی اسکیم کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ میں کبھی اس کے احکام پر نہ چلتا۔ وہ اس وقت واپس آنے کے لئے تیار ہے، کیونکہ اس کے حساب کے مطابق اس کی واپسی میں بہت دن اوپر ہو گئے ہیں۔ ... اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید میں یہ باتیں بھی اسی کے کہنے کے مطابق آپ کو بتا رہا ہوں"

دوسرے تخلیقی فن کاروں کی طرح پر فلار ائٹر بھی پرلے درجے کا سکی تھا پرانے ہیرو کی یہ باتیں فوراً ذہن میں بیٹھ گئیں، لیکن جب لتیکا واپس آئی تو اس نے عاشق صادق کے سے گلے شکوے شروع کر دیئے اور اس کو بیوفائی کا مجرم قرار دیا۔

لتیکا خاموش رہی۔ اس نے اپنی بے گناہی کے جواز میں کچھ نہ کہا۔ پرانے ہیرو نے اس کے متعلق جو باتیں اس کے شوہر سے کی تھیں، اس نے ان پر بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔ اس کے کہنے کے مطابق پرانے ہیرو کی تنخواہ دوگنی ہو گئی۔ اب وہ اس سے باتیں بھی کرتی تھی، لیکن ان کے درمیان وہ فاصلہ بدستور قائم

رہا جس کی حدود شروع ہی سے مقرر کر چکی تھی۔

فلم پھر کامیاب ہوا۔ جو اس کے بعد پیش ہوا اسے بھی کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن اس دوران میں انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے خطوط پر چل کر اور کئی ادارے فلم سازی کی نئی راہیں کھول چکے تھے۔ متعدد نئے چہرے جو لتیکا کے مقابلے میں کئی گنا پُرکشش تھے، اسکرین پر پیش ہو چکے تھے۔ پرانے ہیرو کا خیال تھا کہ لتیکا ضرور اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی اور فلم ساز کی آغوش میں چلی جائے گی، جو اس کے وجود میں نئے جزیرے دریافت کر سکے۔ لیکن بہت دیر تک کوئی قابلِ ذکر بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔

اسٹوڈیو میں لتیکا کے متعلق ہر روز مختلف باتیں ہوتی تھیں۔ سب یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ خاوند کے ساتھ اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں۔ ان کے بارے میں کئی روائتیں مشہور تھیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنے سائیس کے ساتھ خراب ہے۔ یہ روایت پرانے ہیرو سے تھی۔ اس کو یقین تھا کہ لتیکا اپنے سائیس رام بھروسے کے ذریعے سے اپنی جسمانی خواہشات پوری کرتی ہے اور اپنے خاوند پر فلا رائے سے اس کے تعلقات صرف نمائشی بستر تک محدود ہیں ــــ!

پرانا ہیرو اپنے اس مفروضے کے جواز میں یہ کہتا تھا ــــ "لتیکا جیسی عورت اس قسم کے تعلقات صرف ادنےٰ قسم کے نوکر ہی سے پیدا کر سکتی ہے جو اس کے

اشارے پر آئے اور اشارے ہی پر چلا جائے۔ جس کی گردن اس کے احسان تلے دبی رہے ـــــ اگر وہ عشق و محبت کرنے کی اہلیت رکھتی تو نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ کر پھر واپس نہ آتی ـــــ یہ اس کا اسٹنٹ تھا اور اس کا پول کھل چکا ہے ـ ـ ـ تم یقین مانو کہ اس کے دن لد چکے ہیں، اور وہ اسے جانتی ہے اور اچھی طرح سمجھتی ہے اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ مسٹر رائے کی تمام طاقتیں اسے بنانے اور سنوارنے میں ختم ہو چکی ہیں، اب وہ آم کی چسی ہوئی گٹھلی کے مانند ہے ـــــ اس میں وہ رس نہیں رہا جس سے وہ اتنی دیر امرت حاصل کرتی رہی تھی ـــــ تم دیکھ لینا، تھوڑے ہی عرصے کے بعد اپنی کایا کلپ کرانے کی خاطر وہ کسی اور فلم ساز کی آغوش میں چلی جائے گی۔"

لتیکا کسی اور فلم ساز کی آغوش میں نہ گئی! ایسا معلوم ہوتا کہ یہ موڑ اس کے بنائے ہوئے نقشے میں نہیں تھا۔ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ جانے کے بعد اس میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سرہاورڈ بیسکل کے ساتھ صبح سویرے باغبانی میں مصروف وہ اب بھی اسی طرح نظر آتی تھی۔ اسٹڈیو میں اس کے بارے میں جو باتیں ہوتی تھیں، اس کے علم میں تھیں، مگر وہ خاموش رہتی تھی۔ اسی طرح پُر تمکنت طور پر خاموش!

دو فلم اور بنے جو بہت بری طرح ناکام ہوئے۔ انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا روشن نام مدھم پڑنے لگا۔ لتیکا پر اس کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا۔ مگر اسٹڈیو کا ہر آدمی جانتا تھا کہ مسٹر رائے سخت پریشان ہیں۔ پرانے ہیرو نے جو اپنے آقا کی قدر کرتا تھا

اور اس کا ہمدرد بھی تھا کئی بار اسے رائے دی کہ وہ کمپنی کے بکھیڑوں سے الگ ہو جائے۔ فلم سازی کا کام اپنے شاگردوں کو سونپ دے اور خود آرام و سکون کی زندگی بسر کرنا شروع کر دے۔ مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ پرفلا رائے ایک بار پھر اپنے خواب ساز دماغ کی منتشر اور مضمحل قوتیں مجتمع کرنا چاہتا ہے اور لتیکا کے وجود کے ڈھیلے تانے بانے میں ایک نئے اور دیرپا خواب کے نقش ابھارنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

گھر کے نوکروں سے جو خبریں باہر آتی تھیں، ان سے پتہ چلتا تھا کہ مسٹر رائے کا مزاج بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ ہر وقت جھنجھلایا رہتا ہے۔ کبھی کبھی غصے میں آ کر لتیکا کو گندی گندی گالیاں بھی دیتا ہے، مگر وہ خاموش رہتی ہے۔ رات کو جب مسٹر رائے کو شب بیداری کی شکایت ہوتی ہے تو وہ اس کا سر سہلاتی ہے، پاؤں دباتی ہے اور سُلا دیتی ہے۔

پہلے مسٹر رائے کبھی اصرار نہیں کرتے تھے کہ لتیکا ان کے پاس سوئے، پر اب وہ کئی بار راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسے ڈھونڈتے تھے اور اس کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ سوئے۔ پرانے ہیرو کو جب ایسی باتیں معلوم ہوتی تھیں تو اسے بہت دکھ ہوتا تھا" مسٹر رائے بہت بڑا آدمی ہے — لیکن افسوس کہ اس نے اپنا دماغ ایک ایسی عورت کے قدموں میں ڈال دیا جو کسی طرح بھی اس اعزاز کے قابل نہیں تھی — وہ عورت نہیں چڑیل ہے — میرے اختیار

میں ہو تو میں اسے گولی سے اڑا دوں! —— سب سے بڑی ٹریجیڈی تو یہ ہے کہ مسٹر رائے کو اب اس سے بہت زیادہ محبت ہو گئی ہے۔"

جو زیادہ گہرائیوں میں اترنے والے تھے، ان کا یہ خیال تھا کہ پرفلا رائے ہیں چونکہ اب لتیکا کو کوئی اور رنگ روپ دینے کی قوت باقی نہیں رہی، اس لئے وہ جھنجھلا کر اس کو خراب کر دینا چاہتا ہے۔ اب تک وہ اسے ایک مقدس چیز سمجھتا رہا تھا جس پر اس نے گندگی اور نجاست کا ایک ذرہ تک بھی نہیں گرنے دیا تھا۔ مگر اب وہ اسے ناپاک کر دینا چاہتا ہے، غلاظت میں لتھیڑ دینا چاہتا ہے، تاکہ جب وہ کسی کے منہ سے یہ سنے کہ تمہاری لتیکا کو ہم نے فلاں فلاں نجاست سے ملوث کیا ہے تو اسے زیادہ روحانی کوفت نہ ہو۔ وہ پہلے خوابوں کی نرم و نازک دنیا میں بستا تھا، اب حقیقت کے پتھروں کے ساتھ اپنا اور لتیکا کا سر پھوڑنا چاہتا ہے۔

وقت گزرتا گیا، انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے بائیسویں فلم کی شوٹنگ جا رہی تھی، پرفلا رائے ایک بالکل نیا تجربہ کر رہا تھا۔ لیکن اسٹڈیو کے آدمیوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس قسم کا ہے۔ رائے کے دفتر کی بتی رات کو دیر تک جلتی رہتی تھی۔ گھر جانے کے بجائے اب وہ اکثر وہیں سو جاتا تھا۔ کاغذوں کے انبار اس کی میز پر لگے رہتے تھے۔ جب اس کی ایش ٹرے صاف کی جاتی تو جلے ہوئے سگرٹوں کا ایک ڈھیر نکلتا۔ کہانی لکھی جا رہی تھی، مگر کس نوعیت کی۔ اس کے سینریو ڈیپارٹمنٹ

کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔

درزی خانے کے لوگ قریب قریب بیکار تھے۔ ایک دن لتیکا وہاں نمودار ہوئی اور اس نے اپنے لئے لمبی آستینوں والا سیاہ بلاؤز بنانے کا حکم دیا۔ کپڑا اس کی پسند کے مطابق آیا، ڈیزائن بھی اس نے خود منتخب کیا، اس کے ساتھ ہی اس نے سیاہ جارجٹ کی ساڑھی منگوائی۔ پھر ہیئر ڈریسر مس ڈی میلو سے اپنے نئے ہیر اسٹائل کے متعلق مفصل بات چیت کی۔ یہ باتیں جب اسٹوڈیو میں عام ہوئیں تو لوگوں نے نئے فلم کے متعلق اپنی اپنی فکر کے مطابق اندازے لگائے۔ پرانے ہیرو کا یہ خیال تھا کہ مسٹر رائے شاید اپنی زندگی کی ٹریجیڈی پیش کریں گے۔ لیکن جب پہلی شوٹنگ کی اطلاع بورڈ پر لگی اور سیٹ پر کام شروع ہوا تو لوگوں کو بڑی ناامیدی ہوئی۔ وہی پرانا ماحول تھا، اور وہی پرانے ملبوسات۔

شوٹنگ حسب معمول بڑے ہموار طریقے پر جاری رہی، لیکن اچانک ایک دن اسٹوڈیو میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پرفلا رائے حسب معمول سیٹ پر نمودار ہوا۔ چند لمحات اس نے شوٹنگ دیکھی اور ایک دم کیمرہ مین پر برس پڑا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ زور کا تھپڑ اس کے کان پر جڑ دیا جس کے باعث وہ بے ہوش ہو گیا۔ پہلے تو اسٹوڈیو کے آدمی خاموش رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسٹر رائے پر دیوانگی طاری ہے تو انہوں نے مل کر اسے پکڑ لیا اسے گھر لے گئے۔

اچھے سے اچھے ڈاکٹر بلائے گئے مگر پرفلا رائے کی دیوانگی بڑھتی گئی وہ

بار بار لتیکا کو اپنے پاس بلاتا تھا مگر جب وہ اس کی نظروں کے سامنے آتی تھی تو اس کا جوش بڑھ جاتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے نوچ ڈالے، اتنی گالیاں دیتا تھا، ایسے ایسے بُرے ناموں سے اسے یاد کرتا تھا کہ سننے والے حیرت زدہ ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگتے تھے۔

پورے چار دن تک پر فلار لائے پر دیوانگی طاری رہی۔ بہت خطرناک قسم کی دیوانگی۔ پانچویں روز صبح سویرے جب کہ لتیکا سرہاورڈ پیسیکل کے ساتھ باغبانی میں مصروف تھی اور دبی دبی زبان میں اپنے خاوند کی افسوسناک بیماری کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ اطلاع پہنچی کہ مسٹر رائے آخری سانس لے رہے ہیں۔ یہ سن کر لتیکا کو غش آگیا۔ سرہاورڈ اور اسٹڈیو کے دوسرے آدمی ان کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے کہ دوسری اطلاع پہنچی کہ مسٹر رائے سورگباش ہو گئے۔

دس بجے کے قریب جب لوگ ارتھی اٹھانے کے لئے کوٹھی پہنچے تو لتیکا نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بال پریشان تھے۔ سیاہ ساڑھی اور سیاہ بلاؤز پہنے ہوئے تھی ۔ پرانے بیرے نے اس کو دیکھا اور بڑی نفرت سے کہا۔

"کمبخت کو معلوم تھا کہ یہ سین کب شوٹ کیا جانے والا ہے۔۔۔"

نفسیاتی مُطالعہ

مجھے چائے کے لئے کہہ کر، وہ اور اُن کے دوست پھر اپنی باتوں میں غرق ہو گئے۔

گفتگو کا موضوع، ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیب تھا۔ شروع شروع میں تو یہ لوگ اردو کے افسانوی ادب پر طائرانہ نظر دوڑاتے رہے، لیکن بعد میں یہ نظر گہرائی اختیار کر گئی اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، گفتگو گرما گرم بحث میں تبدیل ہو گئی۔

میرے شوہر، ترقی پسند ہیں نہ رجعت پسند، لیکن بحث پسند ضرور ہیں، چنانچہ اپنے دوستوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ گرمجوش وہی نظر آتے تھے۔ وہ اس اندیشے کے یکسر خلاف تھے کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کا مستقبل

تاریک ہے۔ بحث کے دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے بالکل "تم آج شام کو ساڑھی پہنو گی" کے سے فیصلہ کن انداز میں اپنے دوست حبیب سے کہا "تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک زندہ رہے گی۔"

حبیب صاحب فوراً سر تسلیم خم کر دینے والے نہیں تھے، چنانچہ بحث جاری رہی، اور جب میں چائے تیار کرنے کے لئے اٹھی تو حفیظ اللہ صاحب جن کو سب اُلّا کہہ کر پکارتے تھے پچیسواں سگرٹ پھونکتے ہوئے ترقی پسند ادب پر کرملین کے اشتمالی اثر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش شروع کرنے والے تھے۔

میں اٹھ کر باورچی خانے میں آئی تو نوکر غائب تھا اور چائے کا پانی چولھے پر دھرا بالکل غارت ہو چکا تھا۔ میں نے کیتلی کا پانی تبدیل کیا اور باہر نکل کر نوکر کو آواز دی۔ وہ جب آیا تو اس کے ہاتھ میں "اداکار" کا پرچہ تھا جس کے سرورق پر منور ما کی نیم برہنہ تصویر چھپی ہوئی تھی۔ میں نے جھڑک کر پرچہ اس کے ہاتھ سے لیا۔ "جب دیکھو واہیات پرچے پڑھ رہا ہے — چائے کا پانی اُبل اُبل کر تیل بن چکا ہے اس کا کچھ خیال ہی نہیں — جاؤ، پیسٹری لے کر آؤ — ہلٹا منٹی میں آنا۔"

میں نے پرس میں سے ایک پانچ کا نوٹ اس کو دیا اور باورچی خانے میں لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر "اداکار" کی تصویریں دیکھنا شروع کر دیں۔ تصویریں دیکھ چکنے کے بعد میں سوال جواب پڑھ رہی تھی کہ پیسٹری آگئی۔ "اداکار" کا پرچہ میز پر رکھ کر میں نے سب دانے الگ الگ طشتریوں میں چُنے اور نوکر سے یہ کہہ کر وہ دودھ گرم کر کے

جلدی چائے لے آئے، واپس بڑے کمرے میں چلی آئی۔

جب اندر داخل ہوئی تو وہ اور ان کے دوست قریب قریب خاموش تھے۔ میں سمجھی، شاید ان کی گفتگو ختم ہو چکی ہے، لیکن اُلّا صاحب نے اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک اتار کر رومال سے آنکھیں صاف کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "بھابی جان سے پوچھنا چاہتے ——— شاید وہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں؟"

میں کرسی پر بیٹھنے والی تھی۔ یہ سن کر قدرے رک گئی۔ اب حبیب صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "تشریف رکھئے!"

میں بیٹھ گئی۔ میرے شوہر اپنی جگہ سے اُٹھے اور بالکل "اس کو سینا پرونا نہیں آتا" کے سے انداز میں اپنے دوست اُلّا سے کہا "یہ اس معاملے پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتی"۔

"پوچھنا مجھے تھا" حبیب صاحب نے ان سے پوچھا "کیوں؟"

حسب عادت میرے شوہر گول کر گئے "بس.... !" پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "چائے کب آئے گی؟"

میں نے مسکرا کر جواب دیا "جب آپ مجھ سے روشنی ڈالنے کے لئے کہیں گے"۔

اُلّا صاحب نے چشمہ ناک پر جمایا اور تھوڑا سا مسکرائے "بات یہ ہے بھابی جان کہ.... وہ ہیں نا آپ کی.... میرا مطلب ہے...."

حبیب صاحب نے ان کی بات کاٹ دی "اُف، خدا کی قسم تمہیں اپنا مطلب سمجھانے کا سلیقہ کبھی نہیں آئے گا"۔ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "آپ یہ فرمائیے کہ آپ کا اپنی سہیلی بلقیس جہاں کے متعلق کیا خیال ہے؟"

سوال بڑا اوندھا سا تھا۔ میں جواب سوچنے لگی۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"۔

مُلّا صاحب نے حبیب صاحب کی پسلیوں میں اپنی کہنی سے ایک ٹھونکا دیا "بھئی واللہ، اپنا مطلب واضح طور پر سمجھانے کا سلیقہ ایک فقط تمہیں ہی آتا ہے"۔

"ٹھیرو یار"۔ حبیب جھنجھلا گئے۔ انھوں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور جھنجھلاہٹ دور کرتے ہوئے مجھ سے کہا "ابھی ابھی بلقیس کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اردو کے موجودہ ادب میں اس خاتون کا جو رتبہ ہے ــــ میرا مطلب ہے کہ ان کا ایک خاص مقام ہے۔ افسانہ نگاری میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں وہ بہت آگے ہیں ــــ جہاں تک نفسیات کے مطالعے کا تعلق ہے۔۔۔۔"

حبیب صاحب جیسے یہ کہنے کے لئے بیتاب تھے۔ "ان کا مطالعہ بہت گہرا ہے"۔

"خاص طور پر مردوں کی جنسی نفسیات کا"۔ میرے شوہر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

مُلّا صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر میرے شوہر کے الفاظ دہرائے۔ "جی ہاں

خاص طور پر مردوں کی جنسی نفسیات کا۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ دفعتہً محجوب سے ہو گئے اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ مجھے اُن پر کچھ ترس آیا چنانچہ میں نے ذرا بیباکی سے کہا "آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

اُلّا صاحب خاموش رہے۔ ان کی جگہ حبیب بولے "چونکہ آپ بلقیس صاحبہ کی سہیلی ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ آپ اُن کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔"

میں نے صرف اتنا کہا۔ "ایک حد تک!"

میرے شوہر نے کسی قدر بے چین ہو کر کہا "بیکار ہے ـــ بالکل بیکار ہے ـــ عورتیں راز کی باتیں نہیں بتایا کرتیں، خاص طور پر جب وہ خود ان کی اپنی صنف سے متعلق ہوں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "کیوں محترمہ، کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔"

میرا خیال ہے وہ ایک حد تک درست کہہ رہے تھے، لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں چاء آ گئی اور گفتگو تھوڑے عرصے کے لئے "چاء کتنی ـــ دودھ کتنا ـــ شکر کتنے چمچ" میں تبدیل ہو گئی۔

اُلّا صاحب پانچویں کریم رول کی کریم اپنے ہونٹوں پر سے چوستے ہوئے پھر بلقیس جہاں کی طرف لوٹے اور بلند آواز میں کہا "کچھ بھی ہو، یہ طے ہے کہ یہ محترمہ ہم مردوں کی جنسی نفسیات کو خوب سمجھتی ہے۔"

ان کا روئے سخن ہم سب کی طرف کم اور ساری دنیا کی طرف زیادہ تھا۔ میں

ان کا یہ فیصلہ سن کر دل ہی دل میں مسکرائی۔ کیونکہ کم بخت بلقیس، اُلاّ صاحب کی جنسی نفسیات خوب سمجھتی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا "بھپتو۔ اگر یہ اُلاّ صاحب تمہارے شوہر نیک اختر کے دوست نہ ہوتے تو خدا کی قسم میں انہیں ایسے چکر دیتی کہ ساری عمر یاد رکھتے ــــ اوّل درجہ کے ریشہ خطمی انسان ہیں ــــ ایکسٹریم لائنڈ عاشق"۔

مجھے معلوم نہیں بلقیس نے اُلاّ صاحب کے متعلق یہ رائے کیسے قائم کی تھی۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں گدلی گدلی سی ہو رہی تھیں ــــ اسٹریم لائنڈ عاشق کا کوئی خط مجھے ان کے چہرے پر نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا ایسے معاملے جانچنے کے لئے ایک خاص قسم کی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو قدرت نے صرف بلّی ہی کو عطا کی تھی۔

اُلاّ صاحب نے جب مجھے گھورتے دیکھا تو سٹپٹا سے گئے۔ چھٹے کریم رول کی کریم بہت بری طرح ان کے ہونٹوں سے لتھڑ گئی۔ "معاف کیجئے گا" یہ کہہ کر رومال سے اپنا منہ پونچھا۔ "کیا آپ کی سہیلی بلقیس کے بارے میں میرا خیال غلط ہے"

میں نے اپنے لئے دوسرا کپ بنانا شروع کر دیا۔ "میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی"۔

میرے شوہر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور بالکل "شلجم بن جلائے تم کبھی نہیں پکا سکتیں" کے سے انداز میں کہا۔ "یہ اس بارے میں کبھی کچھ کہہ نہیں سکیں گی"

میں نے غیر ارادی طور پر ان کی طرف دیکھا۔ بلی کی ان کے بارے میں یہ رائے تھی کہ ہنستے ہنستے بننے کے فن میں بڑی مہارت حاصل کر گئے ہیں ــــ بیحد خشک ہیں اور یہ خشکی انہوں نے اپنے وجود میں ادھر ادھر سے ملبہ ڈال ڈال کر پیدا کی ہے بظاہر کسی عورت میں دلچسپی ظاہر نہیں کریں گے مگر ہر عورت کو ایک بار چور نظر سے ضرور دیکھیں گے ــــ دفعتہً انہوں نے میری طرف چور نظر سے دیکھا۔ میں جھینپ گئی۔

الّا صاحب اپنے ہونٹ تسلی بخش طور پر صاف کر چکے تھے۔ ایک سٹیس اٹھا کر وہ میرے شوہر سے مخاطب ہوئے۔" یار تمہاری بیگم صاحبہ نے تو ہمیں بہت بُری طرح ڈس اپائنٹ کیا ہے۔"

حبیب صاحب چا۔ کا آخری گھونٹ پی کر بولے۔" درست ہے ــــ لیکن اس معاملے میں بیوی کے بجائے خاوند کسی حد تک رہبری کر سکتا ہے۔"

الّا صاحب نے پوچھا۔" تمہارا مطلب ہے، بلقیس صاحبہ کے بارے میں؟"

"جی ہاں۔" یہ کہہ کر حبیب صاحب اُٹھے، میرے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔" اپنی بیگم صاحبہ کے ذریعے سے آپ کو بلقیس کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو ضرور معلوم ہوا ہوگا۔"

میرے شوہر نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔" صرف اسی قدر کہ اس کا مطالعہ کتابی نہیں" ــــ یہ کہہ کر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔" کیوں سعیدہ؟"

میں نے ذرا توقف کے بعد کہا "جی ہاں ــــ اسے کتابوں کے مطالعے کا اتنا شوق نہیں!"

میرے شوہر نے ایک دم سوال کیا "تم اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟"

مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں تھی، اس لئے میں نے اپنی معذوری ظاہر کر دی لیکن میں سوچنے لگی کہ جب بلقیس کا کام ہی لکھنا ہے، پھر اسے پڑھنے سے لگاؤ کیوں نہیں ــــ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ نمائش میں گھومتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا "پھپو، یہ نمائش نہیں ایک لائبریری ہے ــــ زندہ اور متحرک کتابوں سے بھری ہوئی ــــ غور تو کرو کتنے دلچسپ کردار چل پھر رہے ہیں"۔

سوچتے سوچتے مجھے اس کی اور بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ عورتوں کے مقابلے میں وہ مردوں سے کہیں زیادہ تپاک سے ملتی اور باتیں کرتی تھی، لیکن گفتگو کا موضوع ادب، شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، میرا خیال ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے مرد اس سے مل کر یقینی طور پر اس نتیجے پہ پہنچتے ہوں گے کہ بہت غیر ادبی قسم کی عورت ہے، کیونکہ عام طور پر وہ گفتگو کا رخ لٹریچر کی طرف آنے ہی نہیں دیتی تھی، لیکن اس کے باوجود اس سے ملاقات کرنے والے بہت خوش خوش جاتے تھے کہ انہوں نے اتنی بڑی ادبی شخصیت کے ایک بالکل نئے اور نرالے پہلو کی جھلک دیکھ لی ہے۔

جہاں تک میں سمجھتی ہوں، بلی اپنی شخصیت کے اس بظاہر بالکل نئے اور

نرالے پہلو کی جھلک خود دکھاتی تھی، بقدرِ ضرورت اور وہ بھی صرف اپنے ملاقاتیوں کے کردار کی صحیح جھلک دیکھنے کے لئے۔ میرے ساتھ اس کو اپنا یہ محبوب اور مجرب نسخہ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی کیونکہ بقول اس کے "میں نے ایک نظر ہی میں تاڑ لیا تھا کہ تم بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی ہو۔"

میں بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی تو نہیں ہوں، لیکن شاید بلی نے یہ رائے اس لئے قائم کی تھی کہ میں نے اس کی بحث پسند، ضدی اور راڑیل طبیعت کے پیش نظر اس سے راہ و رسم بڑھانے سے پہلے ہی اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس کی طبیعت کے خلاف بالکل نہ چلوں گی۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے بعض افسانے جو بڑے بھیٹ قسم کے جنسیاتی یا نفسیاتی ہوتے تھے، میری سمجھ سے عام طور پر اونچے ہی رہتے تھے۔ وہ اکثر ایسے افسانوں کے متعلق پوچھا کرتی تھی "کہو، بھیتو، تم نے میرا فلاں افسانہ پڑھا؟ اور پھر خود ہی کہا کرتی تھی"۔ پڑھا تو ضرور ہوگا، مگر سمجھ میں کیا آیا ہوگا — خاک — خدا کی قسم تم بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی ہو!"

میں یہ افسانے سمجھنے کی کوشش ضرور کرتی، مگر مجھے اس بات سے بڑی الجھن ہوتی کہ بلی عورت ہو کر ایسی گہرائیوں میں کود جاتی ہے، جن میں اترنے سے مرد بھی گھبرائیں۔ میں نے کئی دفعہ اس سے کہا۔ "تم کیوں ایسی باتیں لکھتی ہو کہ مرد بیٹھ کر تمہارے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑاتے ہیں"۔ مگر اس نے ہر بار جواب کچھ اسی قسم کا دیا۔ "اڑانے دو — میں ان کیڑوں کی کیا پروا کرتی ہوں — ایسی

درگت بناؤں گی کہ یاد رکھیں گے"!

وہ کتنے مردوں کی درگت بنا چکی تھی، اس کا مجھے کوئی علم نہیں، لیکن میرٹھ کے ایک ادھیڑ عمر کے شاعر جو دو سال تک اسے عشقیہ خط لکھتے رہے تھے اور جسے وہ دو سال تک ہی شہہ دیتی رہی تھی، انجام کار سب کچھ بھول کر ایک بہت ہی خفیہ خط میں اس کو اپنی بیٹی بنانے پر مجبور ہو گئے تھے، بلکہ یوں کہئے کہ مجبور کر دیئے گئے تھے ––– اس نے مجھے ان کا آخری خط دکھایا تھا ––– خدا کی قسم مجھے بہت ترس آیا تھا بیچارے پر۔

اُلّا صاحب دوسرا اپیٹیں ختم کر چکے تھے ––– حبیب صاحب تفریحاً خالی پیالی میں چمچ ہلا رہے تھے۔ میں اٹھ کر چائے کے برتن جمع کرنے لگی تو اُلّا صاحب نے رسمیہ طور پر کہا "اتنی نفیس چائے کا بہت بہت شکریہ ––– مگر یہ گلہ آپ سے ضرور رہے گا کہ آپ نے بلقیس جہاں صاحبہ کی جنسیات نگاری پر کوئی روشنی نہ ڈالی ––– میں سچ عرض کرتا ہوں کہ بڑے بڑے ماہر جنسیات بھی حیراں ہیں کہ ایک عورت میں اتنی گہری نگاہ کہاں سے آگئی"۔

میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی، میرے شوہر نے رسیور اٹھایا "ہلو ––– ہلو ––– جی ہ ––– جی جی ––– آداب عرض ––– جی ہاں ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھ سے کہا "تمہارا فون ہے"۔ پھر جیسے دفعتہً یاد آیا ہو "بلی ہے"!

اُلّا صاحب، حبیب اور میں بیک وقت بولے: "بلقیس!"
میں نے بڑھ کر ریسیور لیا۔ گو بلقیس آنکھ سے اوجھل تھی، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ جانتی ہے کہ اس کے متعلق یہاں باتیں ہو رہی تھیں --- اس احساس کے باعث میں بوکھلا گئی۔ جلدی جلدی میں اس سے چند باتیں کیں اور ریسیور رکھ دیا --- اس نے مجھے اپنے یہاں بلایا تھا۔
محفل جمی رہی ---- میں گھر کے کام کاج سے جلدی جلدی فارغ ہو کر بلی کے ہاں روانہ ہو گئی۔ کوٹھی کے باہر بے شمار اسباب افراتفری کے عالم میں پڑا تھا، اس لئے کہ سفیدی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی، مگر اُس کا سامان بھی درہم برہم تھا۔ میں ایک کرسی صاف کر کے اس پر بیٹھ گئی، بلی نے ادھر اُدھر دیکھا اور مجھ سے کہا: "میں ابھی آئی"۔
چند منٹ کے بعد ہی وہ واپس آ گئی اور مجھ سے کچھ دُور اسٹول پر بیٹھ گئی میں نے اس سے کہا: "آج تمہارے متعلق بہت باتیں ہو رہی تھیں!"
"اوہ!" اس نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔
"الّا صاحب بھی تھے"۔
"اچھا!"
"میں نے انہیں بہت غور سے دیکھا، مگر مجھے ان میں اسٹریم لائنڈ عاشق کے کوئی آثار نظر نہ آئے"۔

بلی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی، پھر بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا: "مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی؟"

"کیا؟"

"کوئی ایسی خاص نہیں۔"

لیکن اس کے لہجے نے چغلی کھائی کہ بات بہت خاص قسم کی ہے، چنانچہ میں نے فوراً سوچا کہ اس کے لئے خاص بات صرف ایک ہی ہو سکتی ہے —— کسی مرد کے عشق میں گرفتار ہو جانا۔ "آنکھ لڑ گئی کسی سے؟"

بلقیس نے میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا — میں نے جب اُس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ مجھے بہت ہی متردد نظر آئی۔ "بات کیا ہے — آج تم میں وہ شگفتگی نہیں۔"

اس نے پھر مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ "شگفتگی؟ —— نہیں تو سفیدی ہو رہی ہے نا۔ ساری پریشانی اسی کی ہے!" یہ کہہ کر وہ دانتوں سے اپنے ناخن کاٹنے لگی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ اس کو بہت ہی مکروہ سمجھتی تھی۔

چند لمحات خاموشی میں گذر گئے —— میں بے چین ہو رہی تھی کہ وہ جلدی بات کرے، لیکن وہ خدا معلوم کن خیالات میں غرق تھی۔ بالآخر میں نے تنگ آکر اس سے کہا: "کیا تم میرا نفسیاتی مطالعہ تو نہیں کر رہی ہو —— آخر کچھ کہو گی یا نہیں؟"

وہ بڑبڑائی۔ "نفسیاتی مطالعہ . . ." اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو

گرنے لگے۔

میں ابھی اپنے تعجب کا اظہار بھی نہ کرنے پائی تھی کہ وہ اٹھ کر تیزی سے غسلخانے میں چلی گئی۔

بلی کی سدا تمسخر اڑانے والی آنکھیں اور آنسو؟ —— مجھے یقین نہیں آتا تھا مگر اس کا رونا نہایت کرب آلود تھا اور تو کچھ میری سمجھ میں نہ آیا۔ سینے کے ساتھ لگا کر اس کو ڈھارس دی اور کہا "کیا بات ہے میری جان؟"

اس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے، لیکن تھوڑی دیر بعد ایک دم آنسو رک گئے۔ مجھ سے دور ہٹ کر وہ دریچے کے باہر دیکھنے لگی "میں جانتی تھی کہ یہ کھیل خطرناک ہے، لیکن میں نے کوئی پروا نہ کی —— کیا دلچسپ اور مزیدار کھیل تھا!" وہ دیوانوں کی طرح ہنسی "بہت ہی مزیدار کھیل .... اُن کی فطری کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا، چند روز بے وقوف بنایا اور ایک افسانہ لکھ دیا .... کس کا افسانہ ہے —— بلقیس جہاں کا —— جنسی نفسیات کی ماہر کا ...."

اس نے پھر رونا شروع کر دیا اور مجھ سے لپٹ کر کہنے لگی "پھپو —— میری حالت قابلِ رحم ہے!"

"کیا ہوا میری جان؟"

مجھ سے دور ہٹ کر وہ پھر دریچے کے باہر دیکھنے لگی "بلقیس جہاں کا خاتمہ —— کل اسی کمرے میں اس کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا"

"کیسے ؟"

"یہ مجھ سے نہ پوچھو بھیتو" یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی "لیکن نہیں . . . میں تم سے نہیں چھپا سکتی . . . . تو سنو . . . . چند دنوں سے میں سفیدی کرنے والے مزدور کا مطالعہ کر رہی تھی ـــــ کل شام اس وحشی نے اچانک . . . ."

بلقیس نے دھکا دے کر مجھے باہر نکال دیا اور غسل خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

جب میں گھر پہنچی تو الّا صاحب اور حبیب صاحب کے علاوہ اور صاحب بھی موجود تھے ـــــ بلقیس جہاں کی حیرت انگیز جنسی نفسیات نگاری گفتگو کا موضوع تھا۔

موتری

کانگرس ہاؤس اور جناح ہال سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پیشاب گاہ ہے جسے بمبئی میں "موتری" کہتے ہیں۔ آس پاس کے محلوں کی ساری غلاظت اس تعفن بھری کوٹھڑی کے باہر ڈھیریوں کی صورت میں پڑی رہتی ہے۔ اس قدر بدبو ہوتی ہے کہ آدمیوں کو ناک پر رومال رکھ کر بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس موتری میں ایک دفعہ اسے مجبوراً جانا پڑا ــــ پیشاب کرنے کے لئے ناک پر رومال رکھ کر، سانس بند کر کے، وہ بدبوؤں کے اس مسکن میں داخل ہوا فرش پر غلاظت بلبلے بن بن کر پھٹ رہی تھی ــــ دیواروں پر اعضائے تناسل کی مہیب تصویریں بنی تھیں ــــ سامنے کوئلے کے ساتھ کسی نے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

"مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا"

ان الفاظ نے بدبو کی شدت اور بھی زیادہ کر دی۔ وہ جلدی جلدی باہر نکل آیا۔

جناح ہال اور کانگریس ہاؤس دونوں پر گورنمنٹ کا قبضہ ہے۔ لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر جو موتری ہے، اسی طرح آزاد ہے۔ اپنی غلاظتیں اور عفونتیں پھیلانے کے لیے ـــــ آس پاس کے محلوں کا کوڑا کرکٹ اب کچھ زیادہ ہی ڈھیریوں کی صورت میں باہر پڑا دکھائی دیتا ہے۔

ایک بار پھر اُسے مجبوراً اس موتری میں جانا پڑا۔ ظاہر ہے کہ پیشاب کرنے کے لئے۔ ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ بدبوؤں کے اس گھر میں داخل ہوا ـــــ فرش پہ پتلے پاخانے کی پپڑیاں جم رہی تھیں۔ دیواروں پر انسان کے اولاد پیدا کرنے والے اعضا کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا ـــــ "مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا" کے نیچے کسی نے موٹی پنسل سے یہ گھناؤنے الفاظ تحریر کئے ہوئے تھے۔

"ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا"

اس تحریر نے موتری کی بدبو میں ایک تیزابی کیفیت پیدا کر دی ـــــ وہ جلدی جلدی باہر نکل آیا۔

مہاتما گاندھی کی غیر مشروط رہائی ہوئی۔ جناح کو پنجاب میں شکست ہوئی۔ جناح ہال اور کانگریس ہاؤس دونوں کو شکست ہوئی نہ رہائی۔ ان پر گورنمنٹ کا اور اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر جو موتری ہے اس پر بدبو کا قبضہ جاری رہا ——— آس پاس کے محلوں کا کوڑا کرکٹ اب ایک ڈھیر کی صورت میں باہر پڑا رہتا ہے

تیسری بار پھر اسے اس موتری میں جانا پڑا ——— پیشاب کرنے کے لئے نہیں ——— ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ غلاظتوں کی اس کوٹھڑی میں داخل ہوا ——— فرش پر کیڑے چل رہے تھے۔ دیواروں پر انسان کے شرمناک حصوں کی نقاشی کرنے کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی ——— "مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا" اور "ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا" کے الفاظ مدھم پڑ گئے تھے۔ مگر ان کے نیچے سفید چاک سے لکھے ہوئے یہ الفاظ ابھر رہے تھے۔

"دونوں کی ماں کا ہندوستان مارا"

ان الفاظ نے ایک لحظے کے لئے موتری کی بدبو غائب کر دی ——— وہ جب آہستہ آہستہ باہر نکلا تو اسے یوں لگا کہ اسے بدبوؤں کے اس گھر میں ایک بے نام سی مہک آئی تھی۔ صرف ایک لحظے کے لئے۔

(سن تصنیف ۱۹۴۵ء)

لطف

"معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کی شخصیت درحقیقت ایسی ہی تھی جیسی آپ نے افسانے میں پیش کی ہے، یا محض آپ کے دماغ کی پیداوار ہے، پر میں اتنا جانتا ہوں کہ ایسے عجیب و غریب آدمی عام ملتے ہیں — میں نے جب آپ کا افسانہ پڑھا تو میرا دماغ فوراً ہی اپنے ایک دوست کی طرف منتقل ہو گیا — صادق کی طرف . . . . . آپ کے بابو گوپی ناتھ اور اس میں بظاہر کوئی مماثلت نہیں ہے — لیکن میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے . . . . آپ کے بابو گوپی ناتھ کو دولت وراثت میں ملی ہے۔ میرے صادق کو اپنی محنت و مشقت اور ذہانت کے صلے میں۔ دونو شاہ خرچ تھے۔ آپ کا بابو گوپی ناتھ بظاہر بدھو تھا، لیکن دراصل بہت ہوشیار

اور باخبر آدمی تھا۔ میرا صادق اندر باہر سے بالکل ایک جیسا تھا۔ وہ بدھو تھا نہ چالاک ـــــ درمیانے درجے کی عقل و فہم کا آدمی تھا۔ اپنے کام میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار۔ حساب کا پکا۔ لین دین کے معاملے میں بڑا بااصول۔ آپ کے بابو گوپی ناتھ کو لٹ جانے میں مزا آتا ہے۔ اُسے دوسروں کو لوٹنے میں۔ بابو صاحب کو پیروں فقیروں کے تکیوں اور رنڈیوں کے کوٹھوں سے رغبت تھی۔ صادق کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ـــــ مگر ان تمام تفاوتوں کے باوجود میں جب بھی بابو گوپی ناتھ کو صادق کے ساتھ کھڑا کرتا ہوں تو مجھے اُن کے خدوخال ایک جیسے نظر آتے ہیں جیسے وہ جڑواں ہیں۔

میں تجزیہ نہیں کرنا جانتا ـــــ ہو سکتا ہے آپ، جب صادق کا حال مجھ سے سُنیں تو اس کو انسانوں کی کسی اور ہی صف میں کھڑا کر دیں۔ جس میں بابو گوپی ناتھ کی مونچھ کا ایک بال بھی نہ آسکتا ہو، لیکن میں یہی سمجھوں گا کہ آپ کے تجزیے میں غلطی ہوئی ہے اور میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اسے اس صف سے نکال کر اس صف میں شامل کر دیجیے جس میں آپ کا بابو گوپی ناتھ موجود ہے۔

میں افسانہ نگار نہیں ـــــ معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کے حالات آپ نے من و عن بیان کیے ہیں یا اُن میں کچھ ردّوبدل کیا ہے ـــــ بہرحال جو کچھ بھی ہے بہت خوب ہے۔ اور جو کچھ اس افسانے میں ہے، اگر اس کے مطابق بابو گوپی ناتھ نہیں چلا تو لعنت ہے اس پر . . . اور اگر وہ ایسا ہی تھا جیسا کہ افسانے میں

ہے تو اس پر خدا کی رحمت ہو... یقین مانئے ایسے لوگ پرستش کے قابل ہوتے ہیں..... اور صادق کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات دلّی میں ہوئی۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ ٹھیکیداریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ صادقے کی پانچوں گھی میں تھیں اور سر محاورے کے مطابق کڑاہے میں۔ میل ملاپ اور اثر رسوخ کافی تھا اور شاہ خرچ تھا ہی۔ دس بیس پُر تکلف دعوتیں کرتا اور ایک کنٹریکٹ اپنی جیب میں ڈال لیتا۔

ایک بات ہے ـــــ بے شک اس نے بہت کمایا ـــــ دونوں ہاتھوں سے گورنمنٹ کا مال لوٹا۔ لیکن اس میں اس نے ان لوگوں کو برابر کا حصہ دیا جن کے ذریعے سے اس کو اس لوٹ کے مواقع بہم پہنچے تھے ـــــ اسی دوران میں اس کا گذر اُن وادیوں میں ہوا جن کا بابو گوپی ناتھ ایک بہت بڑا ازار تھا۔ لیکن وہ ان میں بھٹکا نہیں۔ دوسروں کے ساتھ محض رواداری کی خاطر جاتا رہا اور واپس گھر آ کر اپنے جوتوں کی گرد جھاڑ کر بیٹھ جاتا رہا۔ اس نے بوتل سے بھی تعارف حاصل کیا، مگر معانقے کی نوبت نہ آنے دی۔ ایک دو گھونٹ پی۔ صرف دوسروں کا ساتھ دینے کے لئے۔

ان کوٹھوں پر جہاں آپ کے بابو گوپی ناتھ کے قول کے مطابق دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے ـــــ صادقے نے خود کو دھوکا دینے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ایک دو بار اسے اپنے ساتھیوں کی خوشی کے لئے رنڈیوں کا منہ چومنا پڑا تھا

اور چند واہیات حرکتیں بھی کرنا پڑی تھیں، مگر اس نے ان سے کوئی لطف حاصل نہیں کیا تھا۔

وہ رنڈی کے متعلق کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اگر ملٹری کے نوجوانوں کے لئے رنڈیاں فراہم کرنے کا ٹھیکہ اسے مل جاتا تو وہ یقیناً ان کے متعلق بڑے غور و فکر سے سوچنا شروع کر دیتا ــــ وہ کاروباری آدمی تھا۔

لیکن ایک دم حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ صادق وہ صادق ہی نہ رہا جنگ ختم ہوئی تو ٹھیکے بھی ختم ہو گئے۔ پھر مقدموں کا کچھ ایسا تانا بندھا کہ صادق کچہریوں کے چکر میں پھنس گیا۔ جو دولت پیدا کی تھی، سب مقدموں کی نذر ہو گئی موٹر کے بجائے اب صادق تانگے پر ہوتا تھا یا سائیکل پر، پہلے نئے سے نیا سوٹ اس کے بدن پر ہوتا تھا۔ اب اسے کپڑوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔

پہلے اس کے خوشامدی دوست اسے نواب صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اب وہ صرف "صادقا" ــــ "اوئے صادقا" رہ گیا تھا۔ مگر ان کی اس تبدیلیٔ تخاطب کو صادق نے قطعاً محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کو اپنے مقدموں کی اتنی فکر تھی کہ وہ ایسی فروعات کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

کچہریوں کے اس چکر میں اس نے اپنی مرضی سے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھوڑے ہی عرصے میں بڑے دھڑلے کا شرابی بن گیا ــــ اسی دوران میں اس کی ملاقات سرحد کے ایک خان سے ہوئی جس کو وہاں کی حکومت

نے صوبہ بدر کر رکھا تھا۔ یہ ملاقات رنڈی کے ایک کوٹھے پر ہوئی۔ زندگی میں صادق پہلی مرتبہ کسی انسان کے خلوص سے متاثر ہوا۔

یہ خان اپنے علاقے کا بہت بڑا رئیس تھا۔ بالکل ان پڑھ مگر جاہل نہیں تھا۔ اس کا دل و دماغ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے پوری طرح روشن تھا۔ وہ ایک بہت بڑا انقلاب چاہتا تھا جو ظلم و ستم کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ سرمائے کی لعنت سے دنیا آزاد ہو جائے ـــــ دنیا آزاد نہ ہو تو کم از کم اس کا صوبہ آزاد ہو جائے ـــــ ان خیالات کی پاداش میں وہ اپنے وطن سے باہر نکال دیا گیا تھا۔

میں آپ کی طرح افسانہ نگار نہیں ہوں۔ مجھ سے حاشیہ آرائی نہیں ہوتی ـــــ خان کا کیریکٹر بھی کم دلچسپ نہیں۔ کسی زمانے میں وہ بڑا پُرجوش سرخ پوش تھا۔ اس تحریک سے وابستہ ہو کر اس نے کئی مرتبہ جیل دیکھی۔ اپنی جائدادیں سے ہزاروں روپے خرچ کئے ـــــ جب بٹوارہ ہُوا تو وہ مسلم لیگی بن گیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح سے اس کو والہانہ عشق ہو گیا۔ مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے اس نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں، لیکن پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ وہ جو تعلیم یافتہ تھے، اس سے آگے بڑھ گئے اور بڑے بڑے منصبوں پر جا بیٹھے ـــــ خان جھنجھلا گیا۔ اس جھنجھلاہٹ میں اس نے اپنے غیض و غضب کا بڑا خام مظاہرہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا گیا۔

جس زمانے میں صادق کی ان سے ملاقات ہوئی، آپ کی حالت بالکل بچوں کی سی تھی۔ ان بچوں کی سی جن کو معمولی سی شرارت پر سخت گیر ماسٹر نے بنچ پر کھڑا کر دیا ہو یا مُرغا بنا کر کلاس کے ایک کونے میں کان پکڑنے کا حکم دے دیا ہو ——
صادق جب بھی مجھ سے ان کی بات کرتا تو کہتا "بڑا بیبا آدمی ہے ——"

کچھ میں بھی اس خان کے متعلق جانتا ہوں۔ یہ واقع ہے کہ صرف "بیبا" ہی ایک ایسا لفظ ہے جو اس کی شخصیت کو پورے طور پر اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے —— وطن سے دور تھا سینکڑوں میل دُور۔ مگر وطن کی یاد اسے کبھی نہیں ستاتی تھی —— اپنے گاؤں میں ایک چھوڑ دو بیویاں تھیں، مگر ان کے متعلق اس نے کبھی تردد کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ اس کو اس طرف سے کامل یقین تھا کہ زمینداری سے جو کچھ وصول ہوتا ہے، اُن کے اخراجات کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ سات آٹھ سو روپیہ ماہوار اس کا منیجر وہاں سے روانہ کر دیتا تھا۔ جو اس کی واکسہال موٹر کے پٹرول اور اس کی شراب پر اٹھ جاتا تھا۔

گھر اس کا ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے پر تھا۔ صوبہ بدر ہونے کے بعد اس نے کچھ دیر اس منڈی کے مختلف کوٹھوں پر جھک ماری۔ آخر کار ایک کوٹھا منتخب کر کے وہاں مستقل طور پر اپنے ڈیرے جما دیئے۔ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد خان صاحب کو محسوس ہوا کہ آپ کو اس کوٹھے کی رنڈی سے عشق ہو گیا ہے۔ آپ نے صادق کو اس راز سے بڑے بیبے پن کے ساتھ آگاہ کیا۔" صادق —— وہ رنڈی جس کے

کوٹھے پر تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، ہمارے دل کے اندر گھس گئی ہے. . . . اس کو بدر کرنے کی کوئی ترکیب تمہارے دماغ کے اندر آتی ہو تو ہم کو بتاؤ۔"

صادق نے اس کو بہت سی ترکیبیں بتائیں جن پر خاں صاحب نے عمل بھی کیا مگر وہ اپنے دل کے اندر سے اس رنڈی کو 'شہر بدر' نہ کر سکے۔ آخر کار انہوں نے ایک بار پھر اسی بیبے پن کے ساتھ صادق سے کہا "صادق — وہ رنڈی ہم پر سوار ہو گئی ہے — ہم اس کو اپنی بیوی بنا لے گا۔"

صادق نے ان کو بہت سمجھایا بجھایا۔ مگر خان صاحب عشق کے ہاتھوں مجبور تھے۔ رنڈی کو بھی وہ پسند آ گئے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ میاں بیوی بن گئے رنڈی کے گھر والوں کو یہ رشتہ بالکل پسند نہ آیا۔ بڑی گڑبڑ ہوئی۔ آخر سمجھوتہ ہو گیا — رنڈی وہیں کوٹھے پر رہی اور خان صاحب اس کے شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہنے لگے۔

صادق نے مجھ سے کہا "خان عجیب و غریب آدمی ہے — اتنے اُونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اخباری اور سیاسی دنیا میں نام رکھتا ہے، لیکن اسے کبھی اتنا خیال نہیں آتا کہ وہ ایک بدنام محلے میں رہتا ہے۔ ایک رنڈی جس کے ہزاروں گاہک تھے، اس کی بیوی ہے — مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ پٹھان ہو کر اس کی غیرت کہاں سو رہی ہے — سرحد میں دو بیویاں پڑی ہیں۔ اولاد موجود ہے مگر وہ کس اطمینان سے ہیرا منڈی کے کوٹھے میں

ایک پچوڑی ہوئی ہڈی چوستا رہتا ہے ۔ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا ہوں تو اس کے بے ریا چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ مجھ سے کہتا ہے ۔ صادق ۔ ۔ ۔ وہ لوگ ادھر راضی خوشی ہے ۔ ۔ ۔ ہمیں کوئی تردد نہیں ۔ ۔ ۔ اور یہ رنڈی بہت اچھا ہے ۔ ۔ ۔ ہم سے محبت کرتا ہے ۔ ۔ ۔ جو عورت اُدھر ہوتا ہے نا، محبت کرنا نہیں جانتا ۔ ناز نخرہ نہیں جانتا ۔ ۔ ۔ اور مجھے یقین آجاتا ہے ۔ مجھے اس کی ہر بات کا یقین آجاتا ہے "

اور یہ واقع ہے کہ صادق جس کو پہلے کسی بات کا یقین نہیں آتا تھا، اب اس خان کے کہنے پر چلتا تھا ۔ جب وہ مقدموں سے فارغ ہوا ۔ تو اس کے کہنے پر اس نے ملٹری کی چھوڑی ہوئی بارکیں ڈھانے اور ان کا ملبہ اٹھوانے کا ٹھیکہ لے لیا ۔ اس کام سے اسے نفرت تھی، مگر خان صاحب کے مشورے کو وہ کیسے ٹال سکتا تھا، چنانچہ ایک برس تک وہ کمہاروں اور ان کے گدھوں اور ملبے کے دُھول غبار میں پھنسا رہا ۔ لیکن اس میں اس نے کافی کمایا ۔

خوشامدی دوست یار، پھر اس کے گرد جمع ہو گئے ۔ میرا خیال تھا کہ وہ انہیں منہ نہیں لگائے گا، لیکن اس نے ان کو دھتکارنے کی کوئی کوشش نہ کی ۔ پہلے صرف دسترخوان پر ان کی شمولیت ہوتی تھی ۔ اب بوتل میں بھی وہ

اس کے شریک ہونے لگے۔ خان نے اس کو بتایا تھا کہ شراب بہت اچھی چیز ہے۔ خصوصاً اس آدمی کے لئے جو صوبہ بدر کر دیا گیا ہو۔ بوتل سے منہ لگاتے ہی ایک نیا صوبہ اس کے دل و دماغ میں آباد ہو جاتا ہے۔ جس میں وہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک جہاں چاہے اسٹول پر کھڑا ہو کے باغیانہ سے باغیانہ تقریر کر سکتا ہے۔ سرمائے کی تمام لعنتوں سے اس کو پاک کر سکتا ہے ـــــ اور پھر رنڈی کا کوٹھا۔ . . . اس سے بہترین گھر تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی گھریلو اور سگی قسم کی ہو تو آدمی اسے گالی نہیں دے سکتا۔ اگر رنڈی ہو تو گندی سے گندی گالی بھی اسے دی جاسکتی ہے ـــــ اس کی ماں کے سامنے۔ اُس کی پھوپھی کے سامنے۔ اس کی چچی کے سامنے ـــــ اور اگر اس کا کوئی باپ موجود ہو تو اس کے بھی سامنے ـــــ پھر وہ اسے اپنے مخصوص خام اور بیبے انداز میں روزمرہ زندگی میں گالی کی اہمیت بیان کرنے لگتا اور اسے بتاتا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے ـــــ اگر آدمی اسے وقتاً فوقتاً اپنے اندر سے باہر نہ نکالے تو تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ جو بالآخر دل و دماغ پر بہت بُرا اثر کرتا ہے ـــــ رنڈی کا کوٹھا ـــــ اور گھریلو گھر۔ . . . زمین و آسمان کا فرق ہے ـــــ وہاں سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اتنا ساز و سامان اور اتنے رشتے ہوتے ہیں کہ آدمی ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو پوری زندگی اسی کوشش میں بسر ہو جائے مگر یہاں رنڈی کے کوٹھے پر ایسی کوئی مشکل نہیں ـــــ اپنا ہولڈال اور ٹرنک

اٹھاؤ۔ اچکن کاندھے پر ڈالو اور کسی ہوٹل میں جا کر بڑے اطمینان سے طلاق کا کاغذ لکھ کر روانہ کر دو۔ . . . ایک بات اور بھی ہے. . . . رنڈی کو سمجھنے میں اگر وقت محسوس ہو تو اس کو استعمال کرنے والے ایسے کئی آدمی موجود ہوں گے جن کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے. . . . پھر گانا بجانا مفت — عیاشی کی عیاشی، شادی کی شادی — جی اکتایا تو چھوڑ کے چلتے بنے. . . . کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ کوئی برا نہیں کہے گا — بلکہ وہ جو شریف ہیں مرحبا کہیں گے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا. . . . رنڈی کو لعنتی کہیں گے جو چمٹ گئی تھی اور خداوند کریم کا شکر بجا لائیں گے کہ اس نے اس سے نجات دلائی — اور رنڈی کی زندگی میں بھی کوئی زلزلہ نہیں آتا — اس کے لگے بندھے گاہک موجود ہی ہوتے ہیں — تمہاری ٹھیکے داری ختم ہوتی ہے تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں کہ چلو ہمارا راستہ کھلا۔"

صادق کو خان رنڈی سے شادی کے فوائد اکثر بتاتا رہتا تھا۔ بڑی سے بڑے خلوص کے ساتھ مُنہ لگا کر اب اس نے رنڈیوں کے کوٹھوں پر بھی آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس نے ان میں وہ بات ابھی تک نہیں دیکھی تھی جس کے متعلق وہ اکثر اپنے پٹھان دوست سے سنا کرتا تھا۔

خان کو صادق کے دل کا حال اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کو پتا چل گیا تھا کہ وہ ہیرا منڈی سے اکتا گیا ہے۔ کاروبار اچھا ہے۔ آمدن کی معقول صورت

پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ اب اپنا گھر بنانا چاہتا ہے، جس میں اس کی ایک عدد بیوی ہو۔ دس عدد بچے ہوں ـــــ کلوٹ ہوں، پوتڑے ہوں، چولھا ہو۔ چمٹا ہو۔ توا ہو ـــــ وہ پھل خریدے تو سیدھا گھر پہنچے۔ شراب کی بوتلوں کے بجائے، دودھ کی بوتلیں خریدے۔ میراثیوں اور بھڑووں کے بجائے شریف لوگوں سے ملے۔ شروع شروع میں تو خان اپنے مخصوص انداز میں اسے ایسے واہیات اقدام سے روکنے کی نرم و نازک کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے محلے میں کسی سے کوئی مناسب و موزوں رشتہ ڈھونڈنے کے لئے کہا ہے تو اس کو بہت کوفت ہوئی۔

"صادق ـــــ یہ تم کیا حماقت کرنے والا ہے۔ ... شادی وادی ہرگز مت کرنا۔ ... یہ دنیا ایسی ہے جہاں کسی وقت بھی تم کو صوبہ بدر یا شہر بدر کر دیا جا سکتا ہے۔ ... میں اتنے برس کانگرس میں رہا ہوں ـــــ سرخ پوش تحریک چلانے میں اتنا کام میں نے کیا ہے کہ تم کو اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا ـــــ میں نے اپنی پولیٹیکل لائف میں صرف یہ سیکھا ہے۔ کہ زندگی میں تم جس کو بھی شریک بناؤ، اٹیچی کیس کی طرح ہونی چاہیئے۔ جس کو تم ہاتھ میں اٹھا کر چلتے بنو۔ ... یا اسے وہیں چھوڑ دو ـــــ وہ زیادہ قیمتی نہیں ہونی چاہیئے۔ ... قیمتی چیزوں کو چھوڑ دینے کا بڑا غم رہتا ہے۔ ... سو برادر، تم شادی نہ کرو۔ ... باز آؤ اس خیال سے۔ ... وہ رنڈی جس کے پاس

تم جانتے ہو، کیا بری ہے ــــ اس سے عشق کرنا شروع کردو ــــ یہ کوئی مشکل کام نہیں ــــ تھوڑی سی پریکٹس کرلو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

صادق نے گھریلو قسم کی عورت سے شادی کے حق میں اپنے دلائل پیش کئے مگر خان کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلی۔

"صادق، تم الو ہے ــــ خدا کی قسم الو ہے۔ . . . تم ہماری بات نہیں مانتا، جس کے پاس دو بیویاں ہیں۔ اپنے قبیلے کی ــــ تم ہماری بات مانو ــــ ہم تمہارا دوست ہے۔ پٹھان ہے۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بولتا ــــ یہ دنیا جس میں ہم جیسے مخلص آدمی کو صوبہ بدر کرنے والے حاکم موجود ہیں، اس میں رنڈی کے کوٹھے ہی کو اپنا گھر بنانا چاہئے ــــ ہم کو تو یہاں بہت آرام ہے . . . . تم بھی ہیرا منڈی میں اپنا گھر بنا لو اور آرام کرو۔"

صادق عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ مجھ سے مل کر وہ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا۔ وہ ہیرا منڈی کے سخت خلاف تھا مگر تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کا قائل ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ اب وہ خان کی کہی ہوئی باتیں یوں سناتا تھا جیسے اس کے دل کو لگ چکی ہیں۔ چنانچہ ایک روز اس نے مجھ سے کہا "میں نے ساری عمر ٹھیکے داری کی ہے ــــ اور ٹھیکے داری سے بڑھ کر بے ایمانی کا اور کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ اس کا اول کھوٹ، اس کا آخر

کھوٹ ــــ یہ ایسا بازار ہے جس میں کوئی کھرا سکّہ نہیں چل سکتا ــــ سنا ہے ولایت میں ایسی مشینیں بنی ہیں جن میں اگر کھوٹے سکّے ڈالے جائیں تو وہ باہر نکال دیتی ہیں ــ لیکن ٹھیکے داری ایک ایسی مشین ہے جس میں اگر کھرے سکّے ڈالے جائیں تو قبول نہیں کرے گی ــــ فوراً باہر نکال دے گی۔ . . مجھے ساری عمر یہی کاروبار کرنا ہے کہ مجھے صرف یہی آتا ہے . . . تو کیوں نہیں ہیرا منڈی ہی میں اپنا گھر بناؤں ــــ وہاں کھرے سکّے چلتے ہیں، لیکن ان کے عوض جو مال ملتا ہے اس میں صرف کھوٹ ہی کھوٹ ہوتا ہے . . . میں سمجھتا ہوں، میری روحانی تسکین کے لئے وہاں کی فضا اچھی رہے گی"

پھر ایک روز اس نے مجھے بتایا "خان بہت خوش ہے ــــ اس کی دونوں بیویاں وہاں سرحد میں اس کے گھر میں خوش ہیں۔ اس کی اولاد بھی خوش ہے ــــ ان کی خیر خیریت اس کو اپنے مخبر کے ذریعے سے معلوم ہوتی رہتی ہے ــــ یہاں ہیرا منڈی میں اس کی رنڈی بھی خوش ہے ــــ اس کی ماں بھی خوش ہے۔ اس کی پھوپھی بھی خوش ہے، اس کے میراثی بھی خوش ہیں ــــ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ خان خوش ہے۔ کبھی کبھی ان حاکموں کے خلاف ایک بیان اخباروں میں شائع کر دیتا ہے جس نے اس کو صوبہ بدر کیا تھا اور اپنی رنڈی کو سنا دیتا ہے ــــ وہ بھی خوش ہو جاتی ہے ــــ اس رات گانے بجانے کی محفل گرم ہوتی ہے اور خان مسند پہ گاؤ تکیے کا سہارا

لے کر یوں بیٹھتا ہے جس طرح ایک تماشبین ـــــ استاد صاحب اور میراثیوں سے اس طرح باتیں کرتا ہے جیسے اس نے نئی نئی تماش بینی شروع کی ہے ـــــ اس کی رنڈی مجرا کرتی ہے اور وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کو دس روپے کا نوٹ دیتا ہے پھر پانچ کا۔ پھر دو کا پھر ایک روپے والا ـــــ اس کے بعد وہ محفل برخواست کر دیتا ہے اور اس رنڈی کے ساتھ سو جاتا ہے اور اس منکوحہ عورت کے ساتھ ایسی رات بسر کرتا ہے جو گناہ آلود ہو ۔ ۔ ۔ میں تو سمجھتا ہوں، یہ بڑے مزے کی چیز ہے ۔ ۔ ۔"

لیکن جب اس رنڈی سے شادی کا سوال پیدا ہوا، یعنی خان نے سب معاملہ تیار کر دیا اور صرف ایجاب و قبول کی رسم باقی رہ گئی تو صادق پیچھے ہٹ گیا۔ خان آگ بگولا ہو گیا۔ میرے سامنے اس نے صادق کو بہت لعن طعن کی۔

"تمہاری سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں صادق ـــــ تم الّو کے پٹھے ہو۔ شریف عورت سے شادی کر کے خدا کی قسم تم پچھتاؤ گے ـــــ یہ دنیا ایسی نہیں ہے۔ پروردگار کی قسم، جس میں شرافت سے شادی کی جائے ـــــ اس میں رنڈی اچھی رہتی ہے ـــــ تم شریف مت بنو۔ یاد رکھو اگر تم شریف بن گئے تو صوبہ بدر کر دیئے جاؤ گے ـــــ تم ہیرا منڈی میں رہو۔ یہاں صرف یہی ایک صوبہ ہے جس میں سے تم بدر نہیں کئے جا سکتے اس لئے کہ اس کے ساتھ کوئی حاکم اپنا رشتہ قائم نہیں کرے گا ـــــ تم گدھے ہو ۔ ۔ ۔ اپنا گھر یہیں بناؤ ۔ ۔ ۔ اس سے بہتر جگہ تمہیں اور کوئی نہیں مل سکتی۔"

صادق نے اپنے محلے میں ایک جگہ بات پکی کر لی تھی جب خان نے اس کو سمجھایا بجھایا تو اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا، لیکن وہ رنڈی سے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "میں نے اب شادی کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے — میں خان کا کہنا ضرور مان لیتا مگر میرا دل نہیں مانتا — میں اب عیش کروں گا — ایک رنڈی کے پاس نہیں کئی رنڈیوں کے پاس جایا کروں گا۔"

اور اس نے متعدد رنڈیوں کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ اسے اب کئی ٹھیکے مل گئے تھے — اس کے پاس پھر دولت کی فراوانی تھی۔ ہیرا منڈی سے جب وہ موٹر میں گذرتا تو چاروں طرف کوٹھوں پہ رنگین مسکراہٹیں تیتریوں کی طرح اڑنے لگتیں — اب وہ پھر نواب صاحب تھا — ہیرا منڈی کا نواب صاحب۔

پورے تین برس تک وہ کھل کھیلتا رہا۔ میرا خیال ہے، یہ غالباً خان کی اس کوشش کا ردِ عمل تھا جو اس نے صادق کو اپنے قالب میں ڈھالنے کے لئے کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے تجربات کا نچوڑ اس کے حلق میں ڈال کر اس کو اپنے جیسا بنا لے، مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صادق ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ وہ پورا اوباش بن گیا — جس راستے اس کو نفرت تھی، وہ اسی کا انتھک مسافر بن گیا۔

میں نے اس کو بارہا سمجھایا کہ دیکھو صادق باز آؤ۔ اپنی جوانی، اپنی صحت اور اپنی دولت یوں برباد نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانا۔ میری باتیں سنتا اور مسکرا دیتا۔ "میری دنیا، کھوٹ کی دنیا ہے۔ اس میں صرف ایک بٹا سو حصہ سیمنٹ ہوتا ہے، باقی

سب ریت ــــ اور وہ بھی جس میں آدھی مٹی ہوتی ہے ــــ میری ٹھیکہ داری میں جو عمارت بنتی ہے۔ اس کی عمر اگر کاغذ پر پچاس سال ہے تو زمین پر دس سال ہوتی ہے.... میں اپنے لئے پختہ گھر کیسے تعمیر کر سکتا ہوں.... رنڈیاں ٹھیک ہیں.... میں نے سوسائٹی کے اس ملبے کا بھی ٹھیکہ لے رکھا ہے ــــ ہر روز ایک نہ ایک بوری ڈھو کر ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔"

وہ بوریاں ڈھو ڈھو کر اپنی دانست میں ٹھکانے لگاتا رہا ــــ میں نے اس سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ وہ بہت بدنام ہو چکا تھا ــــ اس کو معلوم تھا کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ لیکن اس نے مجھے منانے کی کوئی کوشش نہ کی۔

ڈیڑھ برس کے بعد ایک دن اچانک وہ میرے پاس آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہے مگر نہیں کہہ سکتا۔ میں نے اس سے پوچھا "کچھ کہنے آئے ہو؟"

اس نے جواب دیا "ہاں ــــ میں شادی کر رہا ہوں۔"

"کس سے؟"

"ایک رنڈی سے؟"

مجھے بہت غصہ آیا "بکو نہیں۔"

اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میں مجبور ہو گیا ہوں۔"

میں چڑ گیا "مجبوری کیسی؟"

صادق نے سر جھکا کر کہا۔" اس کے نطفہ ٹھہر گیا ہے۔"

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ اس سے کیا کہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ صادق نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور کہنا شروع کیا۔" میں مجبور ہو گیا ہوں —— شادی کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں۔"

صادق نے اس رنڈی سے شادی کر لی —— مگر اس کے کوٹھے کو اس نے اپنا گھر نہ بنایا —— ان لوگوں نے، یہ رنڈی جن کی روزی کا ٹھیکرہ تھی، بہت دنگا فساد کیا۔ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی۔ ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا دیئے اور آخر کامیاب ہو گیا —— اس رنڈی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے چھ مہینے بعد صادق کے دل میں جانے کیا آئی کہ اس نے رنڈی کو طلاق دے دی اور اس سے کہا۔" تمہارا اصل مقام یہ گھر نہیں —— ہیرا منڈی ہے —— جاؤ اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ —— اس کو شریف بنا کر میں تم لوگوں کے کاروبار کے ساتھ ظلم کرنا نہیں چاہتا —— میں خود کاروباری آدمی ہوں —— یہ نکتے اچھی طرح سمجھتا ہوں —— جاؤ، خدا میرے اس نطفے کے بھاگ اچھے کرے —— لیکن دیکھو اسے نصیحت دیتی رہنا کہ کسی سے شادی کی غلطی کبھی نہ کرے —— یہ غلط چیز ہے۔"

معلوم نہیں، جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، صادق کے متعلق زیادہ ہے یا خان کے متعلق —— بہر حال مجھے یہ دونوں اسی صنف کے آدمی معلوم ہوتے

ہیں جس میں آپ کا بابو گوپی ناتھ موجود ہے ـــــ اور اس دنیا میں جہاں صوبہ بدر اور شہر بدر کیا جا سکتا ہو، ایسے آدمی ضرور موجود ہونے چاہئیں جن کو سوسائٹی اپنے اور اپنے بنائے ہوئے قوانین کے منہ پر طمانچے کے طور پر کبھی کبھی مار سکے۔

سڑک کے کنارے

"یہی دن تھے — آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ دھلا ہوا، نکھرا ہوا — اور دھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی — سہانے خوابوں کی طرح۔ مٹی کی باس بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت میرے دل و دماغ میں رچ رہی ہے۔ . . . اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی۔"

"اس نے مجھ سے کہا تھا . . . تم نے مجھے جو یہ لمحات عطا کئے ہیں یقین جانو۔ میری زندگی ان سے خالی تھی — جو خالی جگہیں تم نے آج میری ہستی میں پر کی ہیں، تمہاری شکر گزار رہیں۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید وہ ہمیشہ ادھوری رہتی . . . میری سمجھ میں نہیں آتا میں تم سے اور کیا کہوں . . .

میری تکمیل ہو گئی ہے۔ ایسے مکمل طور پر کہ محسوس ہوتا ہے مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں رہی ۔۔۔ اور وہ چلا گیا ــــ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔"

"میری آنکھیں روئیں ــــ میرا دل رو دیا ۔۔۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے لاکھ مرتبہ پوچھا کہ میری ضرورت اب تمہیں کیوں نہیں رہی ۔۔۔ جبکہ تمہاری ضرورت ــــ اپنی تمام شدتوں کے ساتھ اب شروع ہوئی ہے۔ ان لمحات کے بعد جنہوں نے بقول تمہارے، تمہاری ہستی کی خالی جگہیں پُر کی ہیں۔"

اس نے کہا "تمہارے وجود کے جس جس ذرے کی میری ہستی کی تعمیر و تکمیل کو ضرورت تھی، یہ لمحات چن چن کر دیتے رہے ۔۔۔ اب کہ تکمیل ہو گئی ہے تمہارا اور میرا رشتہ خود بخود ختم ہو گیا ہے۔"

"کس قدر ظالمانہ لفظ تھے ۔۔۔ مجھ سے یہ پتھراؤ برداشت نہ کیا گیا ۔۔۔ میں چیخ چیخ کر رونے لگی ۔۔۔ مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا ۔۔۔ میں نے اس سے کہا "یہ ذرے جن سے تمہاری ہستی کی تکمیل ہوئی ہے، میرے وجود کا ایک حصہ تھے ــــ کیا ان کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں ــــ کیا میرے وجود کا بقایا حصہ ان سے اپنا ناطہ توڑ سکتا ہے؟ ۔۔۔ تم مکمل ہو گئے ہو ۔۔۔ لیکن مجھے ادھورا کر کے ۔۔۔ کیا میں نے اسی لئے تمہیں اپنا معبود بنایا تھا؟"

اس نے کہا "بھونرے، پھولوں اور کلیوں کا رس چوس چوس کر شہد کشید کرتے ہیں، مگر وہ اس کی پھٹک تک بھی ان پھولوں اور کلیوں کے ہونٹوں

تک نہیں لاتے ۔ ۔ ۔ خدا اپنی پرستش کراتا ہے، مگر خود بندگی نہیں کرتا ۔ ۔ ۔ ۔
عدم کے ساتھ خلوت میں چند لمحات بسر کر کے اس نے وجود کی تکمیل کی ۔ ۔ ۔ ۔
لیکن اب عدم کہاں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی اب وجود کو کیا ضرورت ہے ۔
وہ ایک ایسی ماں تھی جو وجود کو جنم دیتے ہی زچگی کے بستر پر فنا ہو گئی تھی"۔

عورت رو سکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دلیلیں پیش نہیں کر سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی سب سے بڑی دلیل اس کی آنکھ سے ڈھلکا ہوا آنسو ہے ۔ ۔ ۔ میں نے اس سے کہا "دیکھو ۔ ۔ ۔ میں رو رہی ہوں ۔ ۔ ۔ میری آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں تم جا رہے ہو تو جاؤ، مگر ان میں سے کچھ آنسوؤں کو تو اپنے رومال کے کفن میں لپیٹ کر ساتھ لیتے جاؤ ۔ ۔ ۔ میں تو ساری عمر روتی رہوں گی ۔ ۔ ۔ مجھے اتنا تو یاد رہیگا کہ چند آنسوؤں کے کفن دفن کا سامان تم نے بھی کیا تھا ۔ ۔ ۔ مجھے خوش کرنے کے لئے"!

اس نے کہا "میں تمہیں خوش کر چکا ہوں ۔ ۔ ۔ تمہیں اس ٹھوس مسرت سے ہمکنار کر چکا ہوں جس کے تم سراب ہی دیکھا کرتی تھیں ۔ کیا اس کا لطف اس کا کیف ۔ تمہاری زندگی کے بقایا لمحات کا سہارا نہیں بن سکتا ۔ تم کہتی ہو کہ میری تکمیل نے تمہیں ادھورا کر دیا ہے ۔ لیکن یہ ادھورا پن ہی کیا تمہاری زندگی کو متحرک رکھنے کے لئے کافی نہیں ۔ ۔ ۔ میں مرد ہوں ۔ آج تم نے میری تکمیل کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کل کوئی اور کرے گا ۔ ۔ ۔ میرا وجود کچھ ایسے آب و گل

سے بنا ہے جس کی زندگی میں ایسے کئی لمحات آئیں گے جب وہ خود کو تشنۂ تکمیل سمجھے گا . . . اور تم ایسی کئی عورتیں آئیں گی جو ان لمحات کی پیدا کی ہوئی خالی جگہیں پُر کریں گی"۔

میں روتی رہی۔ جھنجھلاتی رہی۔

میں نے سوچا ـــــ یہ چند لمحات جو ابھی میری مٹھی میں تھے . . . نہیں . . . میں ان لمحات کی مٹھی میں تھی . . . میں نے کیوں خود کو ان کے حوالے کر دیا ـــ میں نے کیوں اپنی پھڑپھڑاتی روح ان کے منہ کھولے قفس میں ڈال دی . . . اس میں مزا تھا۔ ایک لطف تھا ـــ ایک کیف تھا . . . تھا، ضرور تھا . . . اور یہ اس کے اور میرے تصادم میں تھا . . . لیکن . . . یہ کیا کہ وہ ثابت و سالم رہا . . . اور مجھ میں تریڑے پڑ گئے . . . یہ کیا، کہ وہ اب میری ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن میں اور بھی شدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں ـــــ وہ طاقتور بن گیا ہے۔ میں نحیف ہو گئی ہوں ـــــ یہ کیا کہ آسمان پہ دو بادل ہم آغوش ہوں ـــ ایک رو رو کر برسنے لگا، دوسرا بجلی کا کوندا بن کر اس بارش سے کھیلتا، کڑکڑے لگاتا بھاگ جائے . . . یہ کس کا قانون ہے؟ ـــ آسمانوں کا ؟ ـــ زمینوں کا . . . یا ان کے بنانے والوں کا؟

میں سوچتی رہی اور جھنجھلاتی رہی۔

دو روحوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار

کر جانا — کیا یہ سب شاعری ہے؟ . . . . نہیں، دو روحیں سمٹ کر ضرور اس ننھے سے نکتے پر پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے . . . . لیکن اس کائنات میں ایک روح کیوں کبھی کبھی گھائل چھوڑ دی جاتی ہے . . . کیا اس قصور پر کہ اس نے دوسری روح کو اس ننھے سے نکتے پر پہنچنے میں مدد کی تھی۔

یہ کیسی کائنات ہے۔

یہی دن تھے — آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے . . . اور دھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی . . . اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی . . . وہ موجود نہیں ہے۔ . . . بجلی کا کوندا بن کر جانے وہ کن بدلیوں کی گریہ وزاری سے کھیل رہا ہے . . . اپنی تکمیل کر کے چلا گیا . . . . ایک سانپ تھا جو مجھے ڈس کر چلا گیا . . . لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر کیوں میرے پیٹ میں کروٹیں لے رہی ہے . . . کیا یہ میری تکمیل ہو رہی ہے؟

نہیں، نہیں . . . . یہ کیسے تکمیل ہو سکتی ہے . . . یہ تو تخریب ہے . .

لیکن یہ میرے جسم کی خالی جگہیں کیوں پُر ہو رہی ہیں . . . یہ جو گڑھے تھے کس ملبے سے پُر کئے جا رہے ہیں . . . میری رگوں میں یہ کیسی سرسراہٹیں دوڑ رہی ہیں — میں سمٹ کر اپنے پیٹ میں کس ننھے سے نکتے پر پہنچنے کے لئے پیچ و تاب کھا رہی ہوں . . . میری ناؤ ڈوب کر اب کن سمندروں میں ابھرنے

کے لئے اٹھ رہی ہے....؟

یہ میرے اندر دہکتے ہوئے چولھوں پر کس مہمان کے لئے دودھ گرم کیا جا رہا ہے... یہ میرا دل میرے خون کو دھنک کر کس کے لئے نرم و نازک رضائیاں تیار کر رہا ہے۔ یہ میرا دماغ میرے خیالات کے رنگ برنگ دھاگوں سے کس کے لئے ننھی منی پوشاکیں بن رہا ہے؟

میرا رنگ کس کے لئے نکھر رہا ہے... میرے انگ انگ اور رُوم رُوم میں پھنسی ہوئی ہچکیاں لوریوں میں کیوں تبدیل ہو رہی ہیں...

یہی دن تھے — آسمان اُس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے... لیکن یہ آسمان اپنی بلندیوں سے اتر کر کیوں میرے پیٹ میں تن گیا ہے... اُس کی نیلی نیلی آنکھیں کیوں میری رگوں میں دوڑتی پھرتی ہیں؟

میرے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کے محرابوں ایسی تقدیس کیوں آ رہی ہے؟

نہیں، نہیں... یہ تقدیس کچھ بھی نہیں — میں ان محرابوں کو ڈھا دوں گی... میں اپنے اندر تمام چولھے سرد کر دوں گی جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چڑھی ہیں — میں اپنے خیالات کے تمام رنگ برنگ دھاگے آپس میں الجھا دوں گی...

یہی دن تھے ۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے ۔۔۔ لیکن میں وہ دن کیوں یاد کرتی ہوں، جن کے سینے پر سے وہ اپنے نقش قدم بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔۔۔۔

لیکن یہ ۔۔۔۔ یہ نقشِ قدم کس کا ہے ـــ یہ جو میرے پیٹ کی گہرائیوں میں تڑپ رہا ہے ۔۔۔؟ ـــ کیا یہ میرا جانا پہچانا نہیں ۔۔۔۔

میں اسے کھرچ دوں گی ۔۔۔ اسے مٹا دوں گی ـــ یہ رسولی ہے ـــ پھوڑا ہے ـــ بہت خوفناک پھوڑا ۔

لیکن مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پھاہا ہے ۔۔۔ پھاہا ہے تو کس زخم کا؟ ـــ اس زخم کا جو وہ مجھے لگا کر چلا گیا تھا؟ ـــ نہیں نہیں ـــ یہ تو ایسا لگتا ہے، کسی پیدائشی زخم کے لئے ہے ۔۔۔ ایسے زخم کے لئے جو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا ۔۔۔ جو میری کوکھ میں جانے کب سے سو رہا تھا ۔

یہ کوکھ کیا؟ ۔۔۔ فضول سی مٹی کی ہنڈکلیا ـــ بچوں کا کھلونا ۔ میں اسے توڑ پھوڑ دوں گی ۔

لیکن یہ کون میرے کان میں کہتا ہے "یہ دنیا ایک چورا ہا ہے ۔۔۔ اپنا بھانڈا کیوں اس میں پھوڑتی ہے ۔۔۔ یاد رکھ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی ۔

انگلیاں ۔۔۔ اُدھر کیوں نہ اٹھیں گی، جدھر وہ اپنی ہستی مکمل کر کے چلا

گیا تھا — کیا ان انگلیوں کو وہ راستہ معلوم نہیں ۔ ۔ ۔ یہ دنیا ایک چوراہا ہے ۔ ۔ ۔ لیکن اس وقت تو وہ مجھے ایک دوراہے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا — ادھر بھی ادھورا پن تھا۔ اُدھر بھی ادھورا پن — ادھر بھی آنسو، اُدھر بھی آنسو۔

لیکن یہ کس کا آنسو، میرے سیپ میں موتی بن رہا ہے — یہ کہاں بندھے گا؟

انگلیاں اٹھیں گی — جب سیپ کا منہ کھلے گا اور موتی پھسل کر باہر چوراہے میں گر پڑے گا تو انگلیاں اٹھیں گی — سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی ۔ ۔ ۔ اور یہ انگلیاں سنپولیاں بن بن کر ان دونوں کو ڈسیں گی اور اپنے زہر سے ان کو نیلا کر دیں گی۔

آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے ۔ ۔ ۔ یہ گر کیوں نہیں پڑتا ۔ ۔ ۔ وہ کون سے ستون ہیں جو اس کو تھامے ہوئے ہیں ۔ ۔ ۔ کیا اُس دن جو زلزلہ آیا تھا وہ ان ستونوں کی بنیادیں ہلا دینے کے لئے کافی نہیں تھا ۔ ۔ ۔ یہ کیوں اب تک میرے سر کے اوپر اسی طرح تنا ہوا ہے؟

میری روح پسینے میں غرق ہے ۔ ۔ ۔ اس کا ہر مسام کھلا ہوا ہے۔ چاروں طرف آگ دہک رہی ہے ۔ ۔ ۔ میرے اندر کٹھالی میں سونا پگھل رہا ہے ۔ ۔ ۔ دھونکنیاں چل رہی ہیں، شعلے بھڑک رہے ہیں۔ سونا، آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ابل رہا ہے — میری رگوں میں نیلی آنکھیں دوڑ دوڑ کر ہانپ

رہی ہیں ۔ ۔ ۔ گھنٹیاں بج رہی ہیں ۔ ۔ ۔ کوئی آ رہا ہے ۔ ۔ ۔ کوئی آ رہا ہے۔

بند کر دو ـــ بند کر دو کواڑ ۔ ۔ ۔ ۔

کٹھالی الٹ گئی ہے ۔ ۔ ۔ پگھلا ہؤا سونا بہہ رہا ہے ۔ ۔ ۔ گھنٹیاں بج رہی ہیں ۔ ۔ ۔ وہ آ رہا ہے ۔ ۔ ۔ میری آنکھیں مندر ہی ہیں ۔ ۔ ۔ نیلا آسمان گدلا ہو کر نیچے آ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

یہ کس کے رونے کی آواز ہے ۔ ۔ ۔ اسے چپ کراؤ ۔ ۔ ۔ اس کی چیخیں میرے دل پر ہتھوڑے مار رہی ہیں ـــ چُپ کراؤ ـــ اسے چپ کراؤ ـــ اسے چپ کراؤ ۔ ۔ ۔ میں گود بن رہی ہوں ۔ ۔ ۔ میں کیوں گود بن رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

میری باہنیں کھل رہی ہیں ـــ چولھوں پر دودھ ابل رہا ہے ـــ میرے سینے کی گولائیاں پیالیاں بن رہی ہیں ۔ ۔ ۔ لاؤ اس گوشت کے لوتھڑے کو میرے دل کے دُھنکے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں میں لٹا دو ۔ ۔ ۔ ۔

مت چھینو ـــ مت چھینو اسے ۔ ۔ ۔ مجھ سے جدا نہ کرو ۔ خدا کے لئے مجھ سے جدا نہ کرو۔

انگلیاں ۔ ۔ ۔ انگلیاں ۔ ۔ ۔ اٹھنے دو انگلیاں ـــ مجھے کوئی پروا نہیں ۔ ۔ ۔ یہ دنیا چورا ہا ہے ۔ ۔ ۔ پھوٹنے دو میری زندگی کے تمام بھانڈے ۔ ۔ ۔

میری زندگی تباہ ہو جائے گی؟ ۔ ۔ ۔ ہو جانے دو ۔ ۔ ۔ مجھے میرا گوشت

واپس دے دو۔۔۔ میری روح کا یہ ٹکڑا مجھ سے مت چھینو۔۔۔ تم نہیں جانتے یہ کتنا قیمتی ہے۔۔۔ یہ گوہر ہے جو مجھے ان چند لمحات نے عطا کیا ہے۔۔ ان چند لمحات نے جنھوں نے میرے وجود کے کئی ذرّے چن چن کر کسی کی تکمیل کی تھی اور مجھے اپنے خیال میں ادھورا چھوڑ کے چلے گئے تھے۔۔۔۔ میری تکمیل آج ہوئی ہے۔

مان لو۔۔۔ مان لو۔۔۔ میرے پیٹ کے خلا سے پوچھو — میری دودھ بھری ہوئی چھاتیوں سے پوچھو — ان لوریوں سے پوچھو، جو میرے انگ انگ اور روم روم میں تمام ہچکیاں سلا کر آگے بڑھ رہی ہیں — ان جھولنوں سے پوچھو جو میرے بازوؤں میں ڈالے جا رہے ہیں۔

میرے چہرے کی زردیوں سے پوچھو جو گوشت کے اس لوتھڑے کے گالوں کو اپنی تمام سرخیاں چُسانی رہی ہیں۔۔۔ اُن سانسوں سے پوچھو۔ جو چھپے چوری اس کو اس کا حصہ پہنچاتے رہے ہیں۔

انگلیاں — اٹھنے دو انگلیاں۔۔۔ میں انہیں کاٹ ڈالوں گی۔۔۔ شور مچے گا۔۔۔ میں یہ انگلیاں اٹھا کر اپنے کانوں میں ٹھونس لوں گی — میں گونگی ہو جاؤں گی، بہری ہو جاؤں گی، اندھی ہو جاؤں گی۔۔۔ میرا گوشت، میرے اشارے سمجھ لیا کرے گا۔۔۔ میں اسے ٹٹول ٹٹول کر پہچان لیا کروں گی۔۔۔۔ مت چھینو۔۔۔ مت چھینو اسے — یہ میری کوکھ کی مانگ کا سیندھور

ہے — یہ میری ممتا کے ماتھے کی بندیا ہے . . . . میرے گناہ کا کڑوا پھل ہے؟
— لوگ اس پر تھو تھو کریں گے؟ . . . . میں چاٹ لوں گی یہ سب تھوکیں . . . .
آنول سمجھ کر صاف کر دوں گی . . . .

دیکھو، میں ہاتھ جوڑتی ہوں — تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔
میرے بھرے ہوئے دودھ کے برتن اوندھے نہ کرو . . . . میرے دل کے دھڑکتے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں میں آگ نہ لگاؤ — میری باہوں کے جھولوں کی رسیاں نہ توڑو — میرے کانوں کو ان گیتوں سے محروم نہ کرو جو اس کے رونے میں مجھے سنائی دیتے ہیں۔

مت چھینو — مت چھینو . . . مجھ سے جدا نہ کرو — خدا کے لئے مجھے اس سے جدا نہ کرو۔

لاہور۔ ۲۱ر جنوری

دھوبی منڈی سے پولیس نے ایک نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پایا اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ کسی سنگدل نے بچی کی گردن کو مضبوطی سے کپڑے میں جکڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے۔ مگر وہ زندہ تھی۔ بچی بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

سراج

ناگپاڑہ پولس چوکی کے اس طرف جو چھوٹا سا باغ ہے، اس کے بالکل سامنے ایرانی کے ہوٹل کے باہر، بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر ڈھونڈو کھڑا تھا۔ دن ڈھلے، مقررہ وقت پر وہ یہاں آجاتا اور صبح چار بجے تک اپنے دھندے میں مصروف رہتا۔

معلوم نہیں، اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر سب اسے ڈھونڈو کہتے تھے۔ اس لحاظ سے تو یہ بہت مناسب تھا کہ اس کا کام اپنے ٹوکلوں کے لئے ان کی خواہش اور پسند کے مطابق ہر نسل اور ہر رنگ کی لڑکیاں ڈھونڈنا تھا۔

یہ دھندہ وہ قریب قریب دس برس سے کر رہا تھا۔ اس دوران میں ہزاروں لڑکیاں اس کے ہاتھوں سے گذر چکی تھیں۔ ہر مذہب کی، ہر نسل کی، ہر مزاج کی۔

اس کا اڈہ شروع سے یہی رہا تھا۔ ناگپاڑہ پولس چوکی کے اس طرف۔ باغ کے بالکل سامنے۔ ایرانی ہوٹل کے باہر۔ بجلی کے کھمبے کے ساتھ ـــــــ کھمبا اس کا نشان بن گیا تھا۔ بلکہ مجھے تو وہ ڈھونڈو ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں جب کبھی ادھر سے گذرتا اور میری نظر اس کھمبے پر پڑتی جس پر جگہ جگہ چونے اور کتھے کی انگلیاں پونچھی گئی تھیں تو مجھے ایسا لگتا کہ ڈھونڈو کھڑا ہے اور کالے کانڈی اور سینکے لی سوپاری والا پان چبا رہا ہے۔

یہ کھمبا کافی اونچا تھا۔ ڈھونڈو بھی دراز قد تھا ـــــــ کھمبے کے اوپر بجلی کے تاروں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ کوئی تار دور تک دوڑتا چلا گیا تھا اور دوسرے کھمبے کے تاروں کے الجھاؤ میں مدغم ہو گیا تھا۔ کوئی تار کسی بلڈنگ میں اور کوئی کسی دکان میں چلا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کھمبے کی پہنچ دور دور تک ہے۔ وہ دوسرے کھمبوں سے مل کر گویا سارے شہر پر چھایا ہوا ہے۔

اس کھمبے کے ساتھ ٹیلیفون کے محکمے نے ایک بکس لگا رکھا تھا جس کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً تاروں کی درستی وغیرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ڈھونڈو بھی اسی قسم کا ایک بکس ہے جو لوگوں کی جنسی جانچ پڑتال کے لئے کھمبے کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کیونکہ اسے آس پاس کے علاقے کے علاوہ دور دور کے علاقوں کے ان تمام سیٹھوں کا پتا تھا جن کو وقفوں کے بعد یا ہمیشہ ہی اپنی جنسی خواہشات کے تنے ہوئے یا ڈھیلے تار درست کرانے کی ضرورت

محسوس ہوتی تھی۔

اسے ان تمام چھوکریوں کا بھی پتا تھا جو اس دھندے میں تھیں۔ وہ ان کے جسم کے ہر خدوخال سے واقف تھا۔ ان کی ہر نبض سے آشنا تھا۔ کون کس مزاج کی ہے اور کس وقت اور کس گاہک کے لئے موزوں ہے۔ اس کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ لیکن ایک صرف اس کو سراج کے متعلق ابھی تک کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

ڈھونڈو کئی بار مجھ سے کہہ چکا تھا۔ "سالی کا مستک پھرے لا ہے — سمجھ میں نہیں آتا منٹو صاحب، کیسی چھوکری ہے — گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولا — کبھی آگ، کبھی پانی۔ ہنس رہی ہے۔ قہقہے لگا رہی ہے — لیکن ایک دم رونا شروع کر دے گی — سالی کی کسی سے نہیں بنتی — بڑی جھگڑالو ہے۔ ہر پسنجر سے لڑتی ہے۔ سالی سے کئی بار کہہ چکا کہ دیکھ، اپنا مستک ٹھیک کر، ورنہ جا جہاں سے آئی ہے — انگ پر تیرے کوئی کپڑا نہیں — کھانے کو تیرے پاس ڈبڑھیا نہیں — مارا ماری اور دھاندلی سے تو میری جان کام نہیں چلے گا — پر وہ ایک تخم ہے۔ کسی کی سنتی ہی نہیں"

میں نے سراج کو ایک دو مرتبہ دیکھا ہے۔ بڑی دبلی پتلی لڑکی تھی مگر خوبصورت — اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے بیضوی چہرے پر صرف اپنی بڑائی جتانے کی خاطر چھائی ہوئی ہیں۔ میں

نے جب اس کو پہلی مرتبہ کلیئر روڈ پر دیکھا تھا تو مجھے بڑی الجھن ہوئی تھی۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں سے کہوں کہ بھئی تم تھوڑی دیر کے لیئے ذرا ایک طرف ہٹ جاؤ تاکہ میں سراج کو دیکھ سکوں۔ لیکن میری اس خواہش کے باوجود جو یقیناً میری آنکھوں نے اس کی آنکھوں تک پہنچا دی ہوگی، وہ اسی طرح اس کے سفید بیضوی چہرے پر چھائی رہیں۔

مختصر سی تھی، مگر اس اختصار کے باوجود بڑی جامع معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک صراحی ہے جس میں اس کے حجم سے زیادہ پانی ملی ہوئی شراب بھرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نتیجے کے طور پر یہ سیال چیز دباؤ کے باعث ادھر اُدھر، تڑپ کر بہہ گئی ہے۔

میں نے پانی ملی ہوئی شراب اس لئے کہا ہے کہ اس میں تلخی تھی، وہی جو تیز و تند شراب کی ہوتی ہے، مگر ایسا لگتا تھا کسی دھوکے باز نے اس میں پانی ملا دیا ہے، تاکہ مقدار زیادہ ہو جائے۔ مگر سراج میں نسائیت کی جو مقدار تھی، ویسی کی ویسی موجود تھی اور اس جھنجھلاہٹ سے جو اس کے گھنے بالوں سے اس کی تیکھی ناک سے۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اور اس کی انگلیوں سے، جو نقشہ نویسوں کی نوکیلی اور تیز تیز پنسلیں معلوم ہوتی تھیں، میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہر چیز سے ناراض ہے۔ ڈھونڈو سے ــــ اس کھمبے جس کے ساتھ لگ کر وہ کھڑا رہتا تھا ــــ ان گاہکوں سے جو اس کے لئے لائے

جانتے تھے ـــــ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی جو اس کے سفید بیضوی چہرے پر قبضہ جمائے رکھتی تھیں۔

اس کی پتلی پتلی، نوکیلی انگلیاں جو نقشہ نویسوں کی پنسلوں کی طرح تیز تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بھی ناراض ہے۔ شاید اس لئے کہ جو نقشہ سراج بنانا چاہتی تھی وہ نہیں بنا سکتی تھیں۔

یہ تو ایک افسانہ نگار کے تاثرات ہیں جو چھوٹے سے تل میں سنگِ اسود کی تمام سختیاں بیان کرسکتا ہے ـــــ آپ ڈھونڈو کی زبانی سراج کے متعلق سنئے اس نے مجھ سے ایک دن کہا "منٹو صاحب ـــــ آج سالی نے پھر ٹنٹا کر دیا ـــــ وہ تو جانے کس دن کا ثواب کام آ گیا ـــــ اور آپ کی دعا سے یوں بھی ناگپاڑہ چوکی کے سب افسر مہربان ہیں، ورنہ کل ڈھونڈو اندر ہوتا ـــــ وہ دھمال مچائی کہ میں تو باپ رے باپ کہتا رہ گیا۔"

میں نے اس سے پوچھا "کیا بات ہوئی تھی؟"

"وہی جو ہوا کرتی ہے ـــــ میں نے لاکھ لعنت بھیجی اپنی ہشت پشت پر کہ حرامی جب تو اس چھوکری کو اچھی طرح جانتا ہے تو پھر کیوں انگلی لیتا ہے ـــــ کیوں اس کو نکال کر لاتا ہے۔ تیری ماں لگتی ہے یا بہن ـــــ میری تو کوئی عقل کام نہیں کرتی منٹو صاحب!"

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ ڈھونڈو نے کوفی ملی چائے

پرچ میں انڈیلی اور سڑپ سڑپ پینے لگا۔ "اصل بات یہ ہے کہ سالی سے مجھے ہمدردی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

ڈھونڈو نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ "جانے کیوں ـــ یہ سالا معلوم ہو جائے تو یہ روز کا ٹنٹا ختم نہ ہو۔" پھر اس نے ایک دم پرچ میں پیالی اوندھی کر کے مجھ سے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے ـــ ابھی تک کنواری ہے۔"

یقین مانئے کہ میں ایک لحظے کے لئے چکرا گیا۔ "کنواری۔"

"آپ کی جان کی قسم"

میں نے جیسے اس کو اپنی بات پر نظرثانی کرنے کے لئے کہا۔ "نہیں ڈھونڈو۔"

ڈھونڈو کو میرا یہ شک ناگوار معلوم ہوا۔ "میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا منٹو صاحب ـــ سولہ آنے کنواری ہے ـــ آپ مجھ سے شرط لگا لیجئے۔"

میں صرف اسی قدر کہہ سکا۔ "مگر ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔"

ڈھونڈو نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔ "ایسا کیوں ہونے کو نہیں سکتا ـــ سراج جیسی چھوکری تو اس دھندے میں بھی رہ کر ساری عمر کنواری رہ سکتی ہے ـــ سالی کسی کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی ـــ مجھے اس کی ساری ہسٹری معلوم نہیں ـــ اتنا جانتا ہوں۔ یہ پنجابن ہے ـــ لیمنگٹن روڈ

پریمیم صاحب کے پاس تھی۔ وہاں سے نکالی گئی کہ ہر پسنجر سے لڑتی تھی۔ دو تین مہینے نکل گئے کہ مڈام کے پاس دس بیس اور چھوکریاں تھیں ـــ پر منٹو صاحب کوئی کب تک کسے کھلاتا ہے ـــ اس نے ایک دن تین کپڑوں میں نکال باہر کیا ـــ یہاں سے فارس روڈ میں دوسری مڈام کے پاس پہنچی۔ وہاں بھی اس کا مسٹک ویسے کا ویسا تھا۔ ایک پسینجر کے کاٹ کھایا ـــ دو تین مہینے یہاں گذرے ۔ ۔ ۔ پر سالی کے مزاج میں تو جیسے آگ بھری ہوئی ہے۔ اب کون اسے ٹھنڈا کرتا پھرے ـــ پھر خدا آپ کا بھلا کرے، کھیت واڑی کے ایک ہوٹل میں رہی ـــ پر یہاں بھی وہی دھمال ـــ منیجر نے تنگ آ کر چلتا کیا ـــ کیا بتاؤں منٹو صاحب۔ نہ سالی کو کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا ـــ کپڑوں میں جوئیں پڑی ہیں۔ سر دو دو مہینے سے نہیں دھویا ـــ چرس کے ایک دو سگرٹ مل جائیں کہیں سے تو پھونک لیتی ہے ـــ یا کسی ہوٹل سے دور کھڑی ہو کر فلمی ریکارڈ سنتی رہتی ہے۔"

میرے لئے یہ تفصیل کافی تھی۔ اس کے ردِ عمل سے میں آپ کو آگاہ نہیں کرنا چاہتا کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے یہ نامناسب ہے۔

میں نے ڈھونڈو سے محض سلسلۂ گفتگو قائم رکھنے کے لئے پوچھا۔ "تم اسے واپس کیوں نہیں بھیج دیتے۔ جب کہ اُسے اس دھندے سے کوئی دلچسپی نہیں ـــ کرایہ تم مجھ سے لے لو!"

ڈھونڈو کو یہ بات بھی ناگوار معلوم ہوئی "منٹو صاحب کرائے سالے کی کیا بات ہے ـــ میں نہیں دے سکتا۔"

میں نے ٹوہ لینی چاہی۔ "پھر تم اسے واپس کیوں نہیں بھیجتے؟"

ڈھونڈو کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو گیا۔ کان میں اڑسے ہوئے سگرٹ کا ٹکڑہ نکال کر اس نے سلگایا اور دھوئیں کو ناک کے دونوں نتھنوں سے باہر پھینک کر اس نے صرف اتنا کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ وہ جائے۔"

میں نے سمجھا۔ الجھے ہوئے دھاگے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں آگیا ہے "کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

ڈھونڈو پر اس کا شدید ردِ عمل ہوا۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں منٹو صاحب"، ـــ پھر اس نے دونوں کان پکڑ کر کھینچے "قرآن کی قسم میرے دل میں ایسا پلید خیال کبھی نہیں آیا ـــ مجھے بس ۔۔۔" وہ رک گیا۔ "مجھے بس، کچھ اچھی لگتی ہے!"

میں نے بڑا صحیح سوال کیا۔ "کیوں؟"

ڈھونڈو نے بھی اس کا بڑا صحیح جواب دیا۔ "اس لئے ـــ اس لئے کہ وہ دوسروں جیسی نہیں ـــ باقی جتنی ہیں۔ سب پیسے کی پیر ہیں ـــ حرامی ہیں اوّل درجے کی ـــ پر یہ جو ہے نا ـــ کچھ عجیب وغریب ہے ـــ نکال کے لاتا ہوں تو راضی ہو جاتی ہے ـــ سودا ہو جاتا ہے ـــ ٹیکسی یا وکٹوریہ میں بیٹھ

جاتی ہے — اب منٹو صاحب، پسینجر سالا موج شوق کے لئے آتا ہے — مال پانی خرچ کرتا ہے — ذرا دبا کے دیکھتا ہے — یا ویسے ہی ہاتھ لگا کے دیکھتا ہے — بس دھمال مچ جاتی ہے۔ مارا ماری شروع کر دیتی ہے — آدمی شریف ہو تو بھاگ جاتا ہے۔ پیسے لا ہو — یا موالی ہو تو آفت . . . . ہر موقعے پر مجھے پہنچنا پڑتا ہے — پیسے واپس کرنے پڑتے ہیں اور ہاتھ پیر الگ جوڑنے پڑتے ہیں — قسم قرآن کی صرف سراج کی خاطر . . . . اور منٹو صاحب آپ کی جان کی قسم اسی سالی کی وجہ سے میرا دھندا آدھا رہ گیا ہے — !

میرے ذہن نے سراج کا جو عقبی منظر تیار کیا تھا، میں اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا ہے کہ جو کچھ ڈھونڈو نے مجھے بتایا وہ اس کے ساتھ ٹھیک طور پر جمتا نہیں تھا۔

میں نے ایک دن سوچا کہ ڈھونڈو کو بتائے بغیر سراج سے ملوں۔ وہ بائی کلہ اسٹیشن کے پاس ہی ایک نہایت واہیات جگہ میں رہتی تھی۔ جہاں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ آس پاس کا تمام فضلہ تھا۔ کارپوریشن نے یہاں غریبوں کے لئے جست کے بے شمار جھونپڑے بنا دیئے تھے۔ میں یہاں ان بلند بام عمارتوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتا جو اس غلاظت گاہ سے تھوڑی دور ایستادہ تھیں۔ کیونکہ ان کا اس افسانے سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا نام ہی

نشیب و فراز کا ہے۔ یا رفعتوں اور پستیوں کا۔

ڈھونڈو سے مجھے اس کے جھونپڑے کا اتا پتا معلوم تھا۔ میں وہاں گیا۔ —— اپنے خوش وضع کپڑوں کو اس ماحول سے چھپاتے ہوئے —— لیکن یہاں میری ذات متعلق نہیں۔

بہرحال میں وہاں گیا —— جھونپڑے کے باہر ایک بکری بندھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو ممیائی۔ اندر سے ایک بڑھیا نکلی —— جیسے پرانی داستانوں کے کرم خوردہ انبار سے کوئی کٹنی لاٹھی ٹیکتی ہوئی —— میں لوٹنے ہی والا تھا کہ ٹاٹ کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے پردے کے پیچھے مجھے دو بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں —— بالکل اسی طرح پھٹی ہوئی جس طرح وہ ٹاٹ کا پردہ تھا۔ پھر میں نے سراج کا سفید بیضوی چہرہ دیکھا اور مجھے ان غاصب آنکھوں پر بڑا غصہ آیا۔

اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں اندر کیا کام کر رہی تھی۔ فوراً سب چھوڑ چھاڑ باہر آئی۔ اس نے بڑھیا کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور مجھ سے کہا "آپ یہاں کیسے آئے؟"

میں نے مختصراً کہا "تم سے ملنا تھا"

سراج نے بھی اختصار ہی کے ساتھ کہا "آؤ اندر!"

میں نے کہا "نہیں میرے ساتھ چلیے"

اس پر کرم خوردہ داستانوں کی کرم خوردہ کٹنی بڑے دکاندارانہ انداز میں

بولی۔" دس روپے ہوں گے"۔

میں نے بٹوہ نکال کر دس روپے اس بڑھیا کو دے دیئے اور سراج سے کہا۔" آؤ سراج" ــــــ!

سراج کی بڑی بڑی آنکھوں نے ایک لمحے کے لئے میری نگاہوں کو راستہ دیا کہ اس کے چہرے کی سڑک پر چند قدم چل سکیں ــــــ میں ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ خوبصورت تھی ــــــ سکڑی ہوئی خوبصورتی حنوط لگی خوبصورتی۔ صدیوں کی محفوظ و مامون اور مدفون کی ہوئی خوبصورتی ــــــ میں نے ایک لمحے کے لئے یوں محسوس کیا کہ میں مصر میں ہوں اور پرانے دفینوں کی کھدائی پر مامور کیا گیا ہوں۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا ــــــ سراج میرے ساتھ تھی۔ ہم دونو ایک ہوٹل میں تھے۔ وہ میرے سامنے، اپنے غلیظ کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے بیضوی چہرے پر قبضہ مخالفانہ کئے تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے صرف سراج کے چہرے ہی کو نہیں، اس کے سارے وجود کو ڈھانپ لیا ہے کہ میں اس کے کسی رونئیں کو بھی نہ دیکھ سکوں

بڑھیا نے جو قیمت بتائی تھی، میں نے ادا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے چالیس رُپے اور سراج کو دیئے تھے ــــــ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بھی اسی طرح لڑے جھگڑے، جس طرح وہ دوسروں کے ساتھ لڑتی جھگڑتی ہے۔ چنانچہ اسی

غرض سے میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہ کی جس سے محبت اور خلوص کی بُو آئے — اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی میں خائف تھا۔ وہ اتنی بڑی تھیں کہ میرے علاوہ میرے اردگرد کی ساری دنیا بھی دیکھ سکتی تھیں۔

وہ خاموش تھی — واہیات طریقے پر اسے چھیڑنے کے لئے ضروری تھا کہ میرے جسم اور ذہن میں غلط قسم کی حرارت ہو۔ چنانچہ میں نے وسکی کے چار پگ پیئے اور اس کو عام پسنجروں کی طرح چھیڑا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میں نے ایک زبردست فضول حرکت کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بارود جو اس کے اندر بھری پڑی ہے، اس کو بھک سے اڑانے کے لئے یہ چنگاری کافی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ وہ کسی قدر پرسکون ہو گئی۔ اٹھ کر اس نے مجھے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے پھیلاؤ میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "چرس کا ایک سگرٹ منگوا دو مجھے!"

"شراب پیو!"

"نہیں — چرس کا سگرٹ پیوں گی!"

میں نے اُسے چرس کا سگرٹ منگوا دیا — اسے ٹھیٹ چرسیوں کے انداز میں پی کر اس نے میری طرف دیکھا — اس کی بڑی بڑی آنکھیں اب اپنا تسلط چھوڑ چکی تھیں — مگر اسی طرح جس طرح کوئی غاصب چھوڑتا ہے — اس کا چہرہ مجھے ایک اجڑی ہوئی، ایک برباد شدہ سلطنت نظر آیا — تاخت و تاراج ملک، اس کا ہر خط، ہر خال — ویرانی کی ایک لکیر تھی —

مگر یہ ویرانی کیا تھی؟ —— کیوں تھی؟ —— بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آبادیاں ہی ویرانوں کا باعث ہوتی ہیں —— کیا وہ اسی قسم کی کوئی آبادی تھی جو شروع ہونے کے بعد کسی حملہ آور کے باعث ادھوری رہ گئی تھی اور آہستہ آہستہ اس کی دیواریں جو ابھی گز بھر بھی اوپر نہیں اٹھی تھیں کھنڈر بن گئی تھیں۔

میں چکر میں تھا، لیکن آپ کو میں اس چکر میں نہیں ڈالنا چاہتا —— میں نے کیا سوچا، کیا نتیجہ برآمد کیا۔ اس سے آپ کو کیا مطلب۔

سراج کنواری تھی یا نہیں۔ میں اس کے متعلق جاننا نہیں چاہتا تھا۔ سلیقے کے دھوئیں ہیں، البتہ اس کی محزون و مخمور آنکھوں میں مجھے ایک ایسی جھلک نظر آئی تھی جس کو میرا قلم بھی بیان نہیں کر سکتا۔

میں نے اس سے باتیں کرنا چاہیں مگر اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھ سے لڑے جھگڑے، مگر یہاں بھی اس نے مجھے ناامید کیا۔

میں اسے گھر چھوڑ آیا۔

ڈھونڈو کو جب میرے اس خفیہ سلسلے کا پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اس کے دوستانہ اور تاجرانہ جذبات دونوں بہت بری طرح مجروح ہوئے تھے۔ اس نے مجھے صفائی کا موقعہ نہ دیا۔ صرف اتنا کہا ”منٹو صاحب آپ سے یہ امید نہ تھی!“ اور یہ کہہ کر وہ مجھ سے ہٹ کر ایک طرف چلا گیا۔

عجیب بات ہے کہ دوسرے روز شام کو وقتِ مقررہ پر وہ مجھے اپنے

اڈّے پر نظر نہ آیا۔ میں سمجھا شاید بیمار ہے۔ مگر اس سے اگلے روز بھی وہ موجود نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ وہاں سے میرا صبح شام آنا جانا ہوتا تھا۔ میں جب اس کھمبے کو دیکھتا۔ مجھے ڈھونڈو یاد آتا۔ میں بائی کلہ اسٹیشن کے پاس ہی جو واہیات جگہ تھی وہاں بھی گیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ سراج کہاں ہے۔ مگر وہاں اب صرف وہ کرم خوردہ کٹنی رہتی تھی۔ میں نے اس سے سراج کے متعلق پوچھا تو وہ بلوپلی مسکراہٹ میں لاکھوں برس کی پرانی جنسی کروٹیں بدل کر بولی " وہ گئی ـــ اور ہیں ـــ منگواؤں!"

میں نے سوچا، اس کا کیا مطلب ہے۔ ڈھونڈو اور سراج دونو غائب ہیں اور وہ بھی میری اس خفیہ ملاقات کے بعد ـــ لیکن میں اس ملاقات کے متعلق اتنا متردد نہیں تھا ـــ یہاں پھر میں اپنے خیالات آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا لیکن مجھے یہ حیرت ضرور تھی کہ وہ دونوں غائب کہاں ہو گئے۔ ان میں محبت کی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ڈھونڈو ایسی چیزوں سے بالاتر تھا۔ اس کی بیوی تھی بچے تھے اور وہ ان سے بے حد محبت کرتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ کیا تھا کہ دونو بیک وقت غائب تھے۔

میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ اچانک ڈھونڈو کے دماغ میں یہ خیال آ گیا ہو کہ سراج کو واپس گھر جانا چاہئے۔ اس کے متعلق وہ پہلے فیصلہ نہیں کر سکا

تھا، پر اب اچانک کر لیا ہو۔

غالباً ایک مہینہ گذر گیا۔

ایک شام اچانک مجھے ڈھونڈو نظر آیا۔ اسی کھمبے کے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بڑی دیر کرنٹ فیل رہنے کے بعد ایک دم واپس آ گیا ہے اس کھمبے میں جان پڑ گئی۔ ٹیلی فون کے ڈبے میں بھی ـــــ چاروں طرف، اوپر، تاروں کے پھیلے ہوئے جال، ایسا لگتا تھا آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

میں اس کے پاس سے گذرا ــــ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں تھے۔ میں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ اس نے اپنے لئے کوفی ملی چائے اور میرے لئے سادہ چائے منگوائی اور پہلو بدل کر اس نے ایسی نشست قائم کی کہ جیسے وہ مجھے کوئی بہت بڑی بات سنانے والا ہے، مگر اس نے صرف اتنا کہا" اور سناؤ منٹو صاحب"!

"کیا سنائیں ڈھونڈو ــــ بس گذر رہی ہے"۔

ڈھونڈو مسکرایا" ٹھیک کہا آپ نے ــــ بس گذر رہی ہے ــــ اور گذرتی جائے گی ــــ لیکن یہ سالا گذرتے رہنا یا گذرنا بھی عجیب چیز ہے ــــ سچ پوچھئے تو اس دنیا میں ہر چیز عجیب ہے"۔

میں نے صرف اتنا کہا" تم ٹھیک کہتے ہو ڈھونڈو"۔

چائے آئی اور ہم دونوں نے پینا شروع کی۔ ڈھونڈو نے پرچ میں اپنی

کوئی مل جائے انڈیلی اور مجھ سے کہا" منٹو صاحب ـــــ اس نے مجھے بتا دی تھی ساری بات ـــــ کہتی تھی، وہ سیٹھ جو تمہارا دوست ہے اس کا مستک پھرے لا ہے"

میں ہنسا" کیوں؟"

"بولی ـــــ مجھے ہوٹل لے گیا ـــــ اتنے روپے دیئے ـــــ پر سیٹھوں والی کوئی بات نہ کی"

میں اپنے اناڑی پن پر بہت خفیف ہوا" وہ قصہ ہی کچھ ایسا تھا ڈھونڈو" اب ڈھونڈو پیٹ بھر کے ہنسا" میں جانتا ہوں ـــــ مجھے معاف کر دینا کہ میں اس روز تم سے ناراض ہو گیا تھا" اس کے اندازِ گفتگو میں ان جانے میں بے تکلفی پیدا ہو گئی" پر اب وہ قصہ خلاص ہو گیا ہے!"

"کون سا قصہ؟"

"اُس سالی سراج کا ـــــ اور کس کا؟"

میں نے پوچھا" کیا ہوا؟"

ڈھونڈو گنگنانے لگا" جس روز آپ کے ساتھ گئی ـــــ واپس آ کر مجھ سے کہنے لگی ـــــ میرے پاس چالیس روپے ہیں ـــــ چلو مجھے لاہور لے چلو ـــــ میں بولا، سالی، یہ ایک دم تیرے سر پر کیا بھوت سوار ہوا ـــــ بولی، نہیں۔ چل ڈھونڈو، تجھے میری قسم ـــــ اور منٹو صاحب، آپ جانتے ہیں

— میں سالی کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا کہ مجھے اچھی لگتی ہے — میں نے کہا چل — سو ٹکٹ کٹا کے ہم دونوں گاڑی میں سوار ہوئے — لاہور پہنچ کر ایک ہوٹل میں ٹھہرے — مجھ سے بولی۔ ڈھونڈو۔ ایک بُرقعہ لادے میں لے آیا — اسے پہن کر وہ لگی سڑک سڑک اور گلی گلی گھومنے ...... کئی دن گذر گئے — میں بولا۔ یہ بھی اچھی رہی ڈھونڈو۔ سراج سالی کا منک تو پھرے لاتھا۔ سالا تیرا بھی بھیجا پھر گیا جو تو اتنی دور اس کے ساتھ آگیا — منٹو صاحب۔ آخر ایک دن اس نے ٹانگہ رکوایا اور ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگی — ڈھونڈو — اس آدمی کو میرے پاس لے آ — میں چلتی ہوں واپس سرائے میں — میری عقل جواب دے گئی — میں ٹانگے سے اُترا تو وہ غائب — اب میں اس آدمی کے پیچھے پیچھے — آپ کی دعا سے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے — میں آدمی آدمی کو پہچانتا ہوں۔ دو باتیں کیں اور میں تاڑ گیا کہ موج شوق کرنے والا ہے — میں بولا بمبئی کا خاص مال ہے — بولا، ابھی چلو — میں بولا۔ نہیں پہلے مال پانی دکھاؤ۔ اس نے اتنے سارے نوٹ دکھائے — میں دل میں بولا — چلو ڈھونڈو — یہاں بھی اپنا دھندا چلتا رہے — پر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ سراج سالی نے سارے لاہور میں اسی کو کیوں چُنا ... میں نے کہا، چلتا ہے ... ٹانگہ لیا اور سیدھا سرائے میں — سراج کو خبر کی

—— وہ بولی۔ ابھی ٹھیر —— میں ٹھیر گیا —— تھوڑی دیر کے بعد اس آدمی کو جو اچھی شکل کا تھا اندر لے گیا —— سراج کو دیکھتے ہی وہ سالا یوں بدکا جیسے گھوڑا —— سراج نے اس کو پکڑ لیا۔"

ڈھونڈو نے یہاں پہنچ کر پیالی سے اپنی ٹھنڈی کوفی ملی چائے ایک ہی جرعے میں ختم کی اور بیڑی سلگانے لگا۔

میں نے اس سے کہا۔ "سراج نے اس کو پکڑ لیا۔"

ڈھونڈو نے بلند آواز میں کہا۔ "ہاں جی —— پکڑ لیا اس سالے کو —— کہنے لگی۔ اب تو کہاں جاتا ہے —— میرا گھر چھڑا کر تو مجھے اپنے ساتھ کس لئے لایا تھا . . . . میں تجھ سے محبت کرتی تھی . . . . تو نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے —— پر جب میں اپنا گھر بار، اپنا ماں باپ چھوڑ کر تیرے ساتھ بھاگ نکلی اور امرتسر سے ہم دونوں یہاں —— اسی سرائے میں آکر ٹھیرے تو رات ہی رات تو بھاگ گیا —— مجھے اکیلی چھوڑ کر —— کس لئے لایا تھا تو مجھے یہاں —— کس لئے بھگایا تھا تو نے مجھے —— میں ہر چیز کے لئے تیار تھی —— پر تو میری ساری تیاریاں چھوڑ کر بھاگ گیا —— آ —— اب میں نے تمہیں بلایا ہے —— میری محبت ویسی کی ویسی قائم ہے . . . . آ . . . . اور منٹو صاحب، وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی —— اس سالے کے آنسو ٹپکنے لگے . . . . رو رو کر معافیاں مانگنے لگا —— مجھ سے

غلطی ہوئی — میں ڈر گیا تھا — میں اب کبھی تم سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔ قسمیں کھاتا رہا . . . . جانے کیا بکتا رہا — سراج نے مجھے اشارہ کیا — میں باہر چلا گیا — صبح ہوئی تو میں باہر کھاٹ پر سو رہا تھا — سراج نے مجھے جگایا اور کہا — چلو ڈھونڈو — میں بولا۔ کہاں؟ — بولی، واپس بمبئی — میں بولا — وہ سالا کہاں ہے — سراج نے کہا۔ سو رہا ہے — میں اس پر اپنا بُرخا ڈال آئی ہوں۔"

ڈھونڈو نے اپنے لئے دوسری کوفی ملے چائے کا آرڈر دیا تو سراج اندر داخل ہوئی — اس کا سفید بیضوی چہرہ نکھرا ہوا تھا اور اس پر اس کی بڑی بڑی آنکھیں دو گرے ہوئے سگنل معلوم ہوتی تھیں۔

سو کینڈل پاور کا بلب

وہ چوک میں قیصر پارک کے باہر جہاں چند ٹانگے کھڑے رہتے ہیں، بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ خاموش کھڑا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!

یہی پارک جو صرف دو برس پہلے اتنی پُر رونق جگہ تھی اب اجڑی اجڑی دکھائی تھی۔ جہاں پہلے عورت اور مرد شوخ و شنگ فیشن کے لباسوں میں چلتے پھرتے تھے۔ وہاں اب بے حد میلے کچیلے کپڑوں میں لوگ ادھر ادھر بے مقصد پھر رہے تھے۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی مگر اس میں وہ رنگ نہیں تھا جو ایک میلے ٹھیلے کا ہوا کرتا تھا۔ آس پاس کی سیمنٹ سے بنی ہوئی بلڈنگیں اپنا روپ کھو چکی تھیں۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ ایک دوسرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

جیسے بیوہ عورتیں۔

وہ حیران تھا کہ وہ غازہ کہاں گیا۔ وہ سیندور کہاں اڑ گیا۔ وہ سُر کہاں غائب ہو گئے جو اس نے کبھی یہاں دیکھے اور سنے تھے ـــ زیادہ عرصہ کی بات نہیں، ابھی وہ کل ہی تو (دو برس بھی کوئی عرصہ ہوتا ہے) یہاں آیا تھا۔ کلکتے سے جب اسے یہاں کی ایک فرم نے اچھی تنخواہ پر بلایا تھا تو اس نے قیصر پارک میں کتنی کوشش کی تھی کہ اسے کرائے پہ ایک کمرہ ہی مل جائے مگر وہ ناکام رہا تھا۔ ہزار فرمائشوں کے باوجود۔

مگر اب اس نے دیکھا کہ جس کنجڑے، جولاہے اور موچی کی طبیعت چاہتی تھی۔ فلیٹوں اور کمروں پر اپنا قبضہ جما رہا تھا۔

جہاں کسی شان دار فلم کمپنی کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ وہاں چولھے سلگ رہے ہیں۔ جہاں کبھی شہر کی بڑی بڑی رنگین ہستیاں جمع ہوتی تھیں۔ وہاں دھوبی میلے کپڑے دھو رہے ہیں۔

دو برس میں اتنا بڑا انقلاب!

وہ حیران تھا۔ لیکن اس کو اس انقلاب کا پس منظر معلوم تھا ـ اخباروں کے ذریعہ سے اور ان دوستوں سے جو شہر میں موجود تھے اسے سب پتہ لگ چکا تھا کہ یہاں کیسا طوفان آیا تھا۔ مگر وہ سوچتا تھا کہ یہ کوئی عجیب و غریب طوفان تھا جو عمارتوں کا رنگ روپ بھی چوس کر لے گیا۔ انسانوں نے انسان قتل کیے

عورتوں کی بے عزتی کی۔ لیکن عمارتوں کی خشک لکڑیوں اور ان کی اینٹوں سے بھی یہی سلوک کیا۔

اس نے سنا تھا کہ اس طوفان میں عورتوں کو ننگا کیا گیا تھا۔ ان کی چھاتیاں کاٹی گئی تھیں۔ یہاں اس کے آس پاس جو کچھ تھا۔ سب ننگا اور جو بھی بریدہ تھا۔

وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ جس کی مدد سے وہ اپنی رہائش کا کوئی بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ اس دوست نے اس سے کہا تھا کہ تم قیصر پارک کے پاس جہاں تانگے کھڑے رہا کرتے ہیں میرا انتظار کرنا۔

دو برس ہوئے جب وہ ملازمت کے سلسلے میں یہاں آیا تھا تو یہ ٹانگوں کا اڈا بہت مشہور جگہ تھی، سب سے عمدہ، سب سے بانکے ٹانگے صرف یہیں کھڑے رہتے تھے۔ کیونکہ یہاں سے عیاشی کا ہر سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ اچھے سے اچھا ریسٹورنٹ اور ہوٹل قریب تھا۔ بہترین چائے، بہترین کھانا اور دوسرے لوازمات بھی۔

شہر کے جتنے بڑے دلال تھے وہ یہیں سے دستیاب ہوتے تھے۔ اس لئے کہ قیصر پارک میں بڑی بڑی کمپنیوں کے باعث روپیہ اور شراب پانی کی طرح بہتے تھے۔

اس کو یاد آیا کہ دو برس پہلے اس نے اپنے دوست کے ساتھ بڑے

عیش کئے تھے۔ اچھی سے اچھی لڑکی ہر رات کو اُن کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اسکاچ جنگ کے باعث نایاب تھی مگر ایک منٹ میں درجنوں بوتلیں مہیا ہو جاتی تھیں۔

ٹانگے اب بھی کھڑے تھے مگر اُن پر وہ کلغیاں، وہ پھندنے، وہ پیتل کے پالش کئے ہوئے ساز و سامان کی چمک دمک نہیں تھی۔ یہ بھی شاید دوسری چیزوں کے ساتھ اڑ گئی تھی۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ فروری کے دن تھے۔ شام کے سائے چھانے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو لعنت ملامت کی اور دائیں ہاتھ کے ویران ہوٹل میں موری کے پانی سے بنائی ہوئی چائے پینے کے لئے جانے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کو ہولے سے پکارا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اس کا دوست آگیا، مگر جب اس نے مڑکر دیکھا تو ایک اجنبی تھا۔ عام شکل و صورت کا، لٹھے کی نئی شلوار، جس میں اب اور زیادہ شکنوں کی گنجائش نہیں تھی۔ نیلی پاپلین کی قمیص، جو لانڈری میں جانے کے لئے بیتاب تھی۔

اس نے پوچھا

"کیوں بھئی۔ تم نے مجھے بلایا؟"

اس نے ہولے سے جواب دیا

"جی ہاں۔"

اس نے خیال کیا کہ مہاجر ہے بھیک مانگنا چاہتا ہے "کیا مانگتے ہو؟"
اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "جی کچھ نہیں۔" پھر قریب آکر کہا۔ "کچھ چاہئے آپ کو؟"

"کیا؟"

"کوئی لڑکی وڑکی۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے سینے میں ایک تیر سا لگا کہ دیکھو اس زمانے میں بھی یہ لوگوں کے جنسی جذبات ٹٹولتا پھرتا ہے ـــــ اور پھر انسانیت کے متعلق اوپر تلے اس کے دماغ میں بڑے حوصلہ شکن خیالات آئے۔ انہی خیالات کے زیر اثر اس نے پوچھا "کہاں ہے؟"

اس کا لہجہ دلّال کے لئے امید افزا نہیں تھا۔ چنانچہ قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"جی نہیں آپ کو ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔"

اس نے اس کو روکا۔ "یہ تم نے کس طرح جانا۔ انسان کو ہر وقت اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو تم مہیا کر سکتے ہو ـــــ وہ سولی پر بھی ـــــ جلتی چتا میں بھی..."
وہ فلسفی بننے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ "دیکھو ـــ اگر کہیں پاس ہی ہے تو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے یہاں ایک دوست کو وقت دے رکھا ہے۔"

دلّال قریب آگیا" پاس ہی ــــ بالکل پاس"۔
"کہاں؟"
"یہ سامنے والی بلڈنگ میں"۔
اس نے سامنے والی بلڈنگ کو دیکھا۔
"اس میں ــــ اس بڑی بلڈنگ میں؟"
"جی ہاں"۔
وہ لرز گیا" اچھا ــــ تو ــــ؟"
سنبھل کر اس نے پوچھا" میں بھی چلوں؟"
"چلئے ــــ لیکن میں آگے آگے چلتا ہوں"۔ اور دلّال نے سامنے والی بلڈنگ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔
وہ سینکڑوں روح شگاف باتیں سوچتا اس کے پیچھے ہولیا۔
چند گزوں کا فاصلہ تھا۔ فوراً طے ہوگیا۔ دلّال اور وہ دونوں اس بڑی بلڈنگ میں تھے جس کی پیشانی پر ایک بورڈ لٹک رہا تھا ــــ اس کی حالت سب سے خستہ تھی جگہ جگہ اکھڑی ہوئی اینٹوں، کٹے ہوئے پانی کے نلوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔
اب شام گہری ہوگئی تھی۔ ڈیوڑھی میں سے گزر کر آگے بڑھے تو اندھیرا شروع ہوگیا۔ چوڑا چکلا صحن طے کر کے وہ ایک طرف مڑا۔ جہاں عمارت بنتے بنتے

رک گئی تھی۔ ننگی اینٹیں تھیں۔ چونہ اور سیمنٹ ملے ہوئے سخت ڈھیر پڑے تھے اور جا بجا بجری بکھری ہوئی تھی۔

دلال نامکمل سیڑھیاں چڑھنے لگا کہ مڑکر اس نے کہا۔

"آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ابھی آیا۔"

وہ رک گیا۔ دلال غائب ہو گیا۔ اس نے منہ اوپر کر کے سیڑھیوں کے اختتام کی طرف دیکھا تو اسے تیز روشنی نظر آئی۔

دو منٹ گذر گئے تو دبے پاؤں وہ بھی اوپر چڑھنے لگا۔ آخری زینے پر اسے دلال کی بہت زور کی کڑک سنائی دی۔

"اٹھتی ہے کہ نہیں؟"

کوئی عورت بولی" کہہ جو دیا مجھے سونے دو۔" اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

دلال پھر کڑکا" میں کہتا ہوں اٹھ ــــ میرا کہا نہیں مانے گی تو یاد رکھ۔۔۔"

عورت کی آواز آئی" تو مجھے مار ڈال ــــ لیکن میں نہیں اٹھوں گی۔ خدا کے لئے میرے حال پر رحم کر۔"

دلال نے پچکارا" اٹھ میری جان۔ ضد نہ کر۔ گزارہ کیسے چلے گا؟"

عورت بولی" گزارہ جائے جہنم میں۔ میں بھوکی مر جاؤں گی۔ خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کر۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

دلال کی آواز کڑی ہو گئی" تو نہیں اٹھے گی۔ حرامزادی، سور کی بچی۔۔۔"

عورت چلّانے لگی "میں نہیں اٹھوں گی ــ نہیں اٹھوں گی ــــ نہیں اٹھوں گی۔"

دلّال کی آواز بھنچ گئی۔

"آہستہ بول ــ کوئی سن لے گا ــ لے چل اٹھ ــ تیس چالیس روپے مل جائیں گے۔"

عورت کی آواز میں التجا تھی "دیکھ میں ہاتھ جوڑتی ہوں ــ میں کتنے دنوں سے جاگ رہی ہوں ــ رحم کر ــ خدا کے لئے مجھ پر رحم کر۔"

"بس ایک دو گھنٹے کے لئے ــ پھر سو جانا ــ نہیں تو دیکھ مجھے سختی کرنی پڑے گی۔"

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کمرے میں جھانکا جس میں بڑی تیز روشنی آ رہی تھی۔

اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس کے فرش پر ایک عورت لیٹی ہے ــ کمرے میں دو تین برتن ہیں، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دلّال اس عورت کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس عورت سے کہا "لے اب اٹھ ــ قسم خدا کی ایک دو گھنٹے میں آجائے گی ــ پھر سو جانا۔"

وہ عورت ایک دم یوں اٹھی جیسے آگ دکھائی ہوئی پھلجھڑی اٹھتی ہے اور

چلائی :" اچھا اٹھتی ہوں"۔

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اصل میں وہ ڈر گیا تھا۔ دبے پاؤں وہ تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اس نے سوچا کہ بھاگ جائے ــــ اس شہر ہی سے بھاگ جائے۔ اس دنیا سے بھاگ جائے ــــ مگر کہاں؟

پھر اس نے سوچا کہ یہ عورت کون ہے؟ کیوں اس پہ اتنا ظلم ہو رہا ہے؟ ــــ اور یہ دلال کون ہے؟ ــــ اس کا کیا لگتا ہے اور یہ اس کمرے میں اتنا بڑا بلب جلا کر جو سو کینڈل پاور سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ کیوں رہتے ہیں۔ کب سے رہتے ہیں؟

اس کی آنکھوں میں اس تیز بلب کی روشنی ابھی تک گھسی ہوئی تھی۔ اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی تیز روشنی میں کون سو سکتا ہے؟ ــــ اتنا بڑا بلب؟ ــــ کیا وہ چھوٹا نہیں لگا سکتے۔ یہی پندرہ پچیس کینڈل پاور کا؟

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ دو سائے اس کے پاس کھڑے ہیں۔ ایک نے جو دلال کا تھا۔ اس سے کہا:

"دیکھ لیجئے"۔

اس نے کہا:" دیکھ لیا ہے"۔

"ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔"

"چالیس روپے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"دے دیجئے۔"

وہ اب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جیب میں اس نے ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر دلّال کے حوالے کر دیئے۔

"دیکھ لو کتنے ہیں!"

نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔

دلّال نے کہا۔ "پچاس ہیں۔"

اس نے کہا۔ "پچاس ہی رکھو۔"

"صاحب سلام۔"

اس کے جی میں آئی کہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کو دے مارے۔

دلّال بولا۔ "تو لے جائیے اسے۔ لیکن دیکھئے تنگ نہ کیجئے گا اور پھر ایک دو گھنٹے کے بعد چھوڑ جائیے گا۔"

"بہتر۔"

اس نے بڑی بلڈنگ کے باہر نکلنا شروع کیا جس کی پیشانی پر وہ کئی بار ایک بہت بڑا بورڈ پڑھ چکا تھا۔

باہر تانگہ کھڑا تھا۔ وہ آگے بیٹھ گیا اور عورت پیچھے۔

دلال نے ایک بار پھر سلام کیا اور ایک بار پھر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارے۔

تانگہ چل پڑا —— وہ اسے پاس ہی ایک ویران سے ہوٹل میں لے گیا —— دماغ کو حتی المقدور اس تکدّر سے جو اُسے پہنچ چکا تھا نکال کر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا جو سر سے پیر تک اجاڑ تھی —— اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ بھی سارے کا سارا خمیدہ تھا جیسے وہ ایک ایسی عمارت ہے جو پل بھر میں گر جائے گی۔

وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"ذرا گردن تو اونچی کیجئے۔"

وہ زور سے چونکی۔ "کیا؟"

"کچھ نہیں —— میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کوئی بات تو کیجئے۔"

اس کی آنکھیں سُرخ بوٹی ہو رہی تھیں جیسے ان میں مرچیں ڈالی گئی ہوں —— وہ خاموش رہی۔

"آپ کا نام؟"

"کچھ بھی نہیں؟" اس کے لہجے میں تیزاب کی سی تیزی تھی۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

"جہاں کی بھی تم سمجھ لو۔"

"آپ اتنا روکھا کیوں بولتی ہیں۔"

عورت اب قریب قریب جاگ پڑی اور اس کی طرف لال بوٹی آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگی "تم اپنا کام کرو۔ مجھے جانا ہے۔"

اس نے پوچھا "کہاں؟"

عورت نے بڑی روکھی بے اعتنائی سے جواب دیا "جہاں سے مجھے تم لائے ہو۔"

"آپ چلی جائیے۔"

"تم اپنا کام کرونا ــــ مجھے تنگ کیوں کرتے ہو؟"

اس نے اپنے لہجے میں دل کا سارا درد بھر کے اس سے کہا "میں تمھیں تنگ نہیں کرتا ــــ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

وہ جھلا گئی "مجھے نہیں چاہیئے کوئی ہمدرد۔" پھر قریب قریب چیخ پڑی "تم اپنا کام کرو اور مجھے جانے دو۔"

اس نے قریب آ کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنا چاہا تو اس عورت نے زور سے ایک طرف جھٹک دیا۔

"میں کہتی ہوں۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ میں کئی دنوں سے جاگ رہی ہوں ــــ جب سے آئی ہوں۔ جاگ رہی ہوں۔"

وہ سرتاپا ہمدردی بن گیا۔

"سو جاؤ یہیں"۔

عورت کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ تیز لہجے میں بولی "میں یہاں سونے نہیں آئی — یہ میرا گھر نہیں"۔

"تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم آئی ہو؟"

عورت اور زیادہ خشمناک ہو گئی۔

"اُف — بکواس بند کرو — میرا کوئی گھر نہیں — تم اپنا کام کرو ورنہ مجھے چھوڑ آؤ اور اپنے روپے لے لو اس . . . . اس . . . ." وہ گالی دیتی رہ گئی۔

اس نے سوچا کہ اس عورت سے ایسی حالت میں کچھ پوچھنا اور ہمدردی جتانا فضول ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں"۔

اور وہ اسے اس بڑی بلڈنگ میں چھوڑ آیا۔

دوسرے دن اس نے قیصر پارک کے ایک ویران ہوٹل میں اس عورت کی ساری داستان اپنے دوست کو سنائی۔ دوست پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا:

"کیا جوان تھی؟"

اس نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں ___ میں اسے اچھی طرح بالکل نہ دیکھ سکا ـ میرے دماغ میں تو ہر وقت یہ خیال آتا تھا کہ میں نے وہیں سے پتھر اٹھا کر دلّال کا سر کیوں نہ کچل دیا۔"

دوست نے کہا۔ "واقعی بڑے ثواب کا کام ہوتا۔"

وہ زیادہ دیر تک ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ اس کے دل و دماغ پر پچھلے روز کے واقعہ کا بہت بوجھ تھا۔ چنانچہ چائے ختم ہوئی تو دونوں رخصت ہو گئے۔

اس کا دوست چپکے سے ٹانگوں کے اڈّے پر آیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نگاہیں اس دلّال کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نظر نہ آیا۔ چھ بج چکے تھے۔ بڑی بلڈنگ سامنے تھی چند گزوں کے فاصلے پر۔ وہ اس طرف چل دیا اور اس میں داخل ہو گیا۔

لوگ اندر آجا رہے تھے۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے اس مقام پر پہنچ گیا۔ کافی اندھیرا تھا مگر جب وہ ان سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اسے روشنی دکھائی دی اوپر دیکھا اور دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر وہ آخری زینے پر خاموش کھڑا رہا۔ کمرے سے تیز روشنی آ رہی تھی۔ مگر کوئی آواز، کوئی آہٹ اسے سنائی نہ دی۔ آخری زینہ طے کر کے وہ آگے بڑھا۔ دروازے

کے پٹ کھلے تھے۔ اس نے ذرا ادھر ہٹ کر اندر جھانکا۔ سب سے پہلے اسے بلب نظر آیا۔ جس کی روشنی اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ ایک دم وہ پرے ہٹ گیا تاکہ تھوڑی دیر اندھیرے کی طرف منہ کرکے اپنی آنکھوں سے چکا چوند نکال سکے۔

اس کے بعد وہ پھر دروازے کی طرف بڑھا مگر اس انداز سے کہ اس کی آنکھیں بلب کی تیز روشنی کی زد میں نہ آئیں۔ اس نے اندر جھانکا —— فرش کا جو حصّہ اسے نظر آیا۔ اس پر ایک عورت چٹائی پر لیٹی تھی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا — سو رہی تھی — منہ پر دوپٹہ تھا۔ اس کا سینہ سانس کے اتار چڑھاؤ سے ہل رہا تھا — وہ ذرا اور آگے بڑھا — اس کی چیخ نکل گئی مگر اس نے فوراً ہی دبالی — اس عورت سے کچھ دور ننگے فرش پر ایک آدمی پڑا تھا جس کا سر پاش پاش تھا — پاس ہی خون آلود اینٹ پڑی تھی۔ یہ سب اس نے ایک دم دیکھا — اور سیڑھیوں کی طرف لپکا — پاؤں پھسلا اور نیچے — مگر اس نے چوٹوں کی کوئی پروا نہ کی اور ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل اپنے گھر پہنچا اور ساری رات ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔

خُدا کی قسم

اُدھر سے مسلمان اور اِدھر سے ہندو ابھی تک آجا رہے تھے۔ کیمپوں کے کیمپ بھرے پڑے تھے۔ جن میں ضرب المثل کے تل دھرنے کے لئے واقعی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ غلّہ ناکافی ہے۔ حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہیں۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ اس کا ہوش کس کو تھا۔ ایک افراط و تفریط کا عالم تھا۔

سن اڑتالیس کا آغاز تھا۔ غالباً مارچ کا مہینہ۔ اِدھر اور اُدھر دونوں طرف رضاکاروں کے ذریعے سے "مغویہ" عورتوں اور بچوں کی برآمدگی کا مستحسن کام شروع ہو چکا تھا۔ سینکڑوں مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اس کارِخیر میں حصہ لے رہی تھیں۔ میں جب ان کو سرگرمِ عمل دیکھتا تو مجھے بڑی

تعجب خیز مسرت حاصل ہوتی۔ یعنی خود انسان، انسان کی برائیوں کے آثار مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جو عصمتیں لٹ چکی تھیں ان کو مزید لوٹ کھسوٹ سے بچانا چاہتا تھا ــــ کس لئے؟

اس لئے کہ اس کا دامن مزید دھبوں اور داغوں سے آلودہ نہ ہو۔؟

اس لئے کہ وہ جلدی جلدی اپنی خون سے لتھڑی ہوئی انگلیاں چاٹ لے اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ دسترخوان پہ بیٹھ کر روٹی کھائے؟ ــــ اس لئے کہ وہ انسانیت کا سوئی دھاگا لے کر، جب تک دوسرے آنکھیں بند کئے ہیں۔ عصمتوں کے چاک رفو کردے؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا ــــ لیکن ان رضاکاروں کی جدوجہد پھر بھی قابلِ قدر معلوم ہوتی تھیں۔

ان کو سیکڑوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہزاروں کھیکھڑے تھے جو انہیں اٹھانے پڑتے تھے۔ کیونکہ جنہوں نے عورتیں اور لڑکیاں اڑائی تھیں، سیماب پا تھے۔ آج ادھر، کل اُدھر۔ ابھی اس محلے میں، ابھی اس محلے میں۔ اور پھر آس پاس کے آدمی بھی ان کی مدد نہیں کرتے تھے۔

عجیب عجیب داستانیں سننے میں آتی تھیں ــــ ایک لیازاں افسر نے مجھے بتایا کہ سہارن پور میں دو لڑکیوں نے پاکستان میں اپنے والدین کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ دوسرے نے بتایا کہ جب جالندھر میں زبردستی ہم نے

ایک لڑکی کو نکالا تو قابض کے سارے خاندان نے اسے یوں الوداع کہی جیسے وہ ان کی بہو ہے اور کسی دور دراز سفر پر جا رہی ہے ـــــ کئی لڑکیوں نے والدین کے خوف سے رستے میں خود کشی کر لی۔ بعض صدموں کی تاب نہ لا کر پاگل ہو چکی تھیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں۔ جن کو شراب کی لت پڑ چکی تھی۔ ان کو پیاس لگتی تو پانی کی بجائے شراب مانگتیں اور ننگی ننگی گالیاں بکتیں۔

میں ان برآمد کی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق سوچتا تو میرے ذہن میں صرف پھولے ہوئے پیٹ ابھرتے ـــــ ان پیٹوں کا کیا ہو گا۔ ان میں جو کچھ بھرا ہے، اس کا مالک کون ہے ـــــ پاکستان یا ہندوستان ؟

اور وہ نو مہینے کی باربرداری ـــــ اس کی اجرت پاکستان ادا کرے گا یا ہندوستان ؟ ـــــ کیا یہ سب ظالم فطرت یا قدرت کے بہی کھاتے میں درج ہو گا ؟ ـــــ مگر کیا اس میں کوئی صفحہ خالی رہ گیا ہے ؟

برآمدہ عورتیں آ رہی تھیں۔ برآمدہ عورتیں جا رہی تھیں۔

میں سوچتا تھا کہ یہ عورتیں مغویہ کیوں کہلائی جاتی تھیں ـــــ انہیں اغوا کب کیا گیا ہے ؟ ـــــ اغوا تو ایک بڑا رومانٹک فعل ہے۔ جس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں روحوں کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ لیکن یہ اغوا کیسا ہے کہ ایک نہتی کو پکڑ کر کوٹھڑی میں قید کر لیا۔

لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ منطق، استدلال اور فلسفہ بیکار چیزیں تھیں۔۔۔ ان دنوں جس طرح لوگ گرمیوں میں بھی دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے سوتے تھے۔ اسی طرح میں نے بھی اپنے دل و دماغ کی سب کھڑکیاں دروازے بند کر دیے تھے۔ حالانکہ انہیں کھلا رکھنے کی زیادہ ضرورت اسی وقت تھی لیکن میں کیا کرتا، مجھے کچھ سوجھتا نہیں تھا۔

برآمدہ عورتیں آ رہی تھیں۔ برآمدہ عورتیں جا رہی تھیں۔

یہ درآمد اور برآمد جاری تھی ۔۔۔ تمام ناجرانہ خصوصیات کے ساتھ!

اور صحافی، افسانہ نگار اور شاعر اپنے قلم اٹھائے شکار میں مصروف تھے ۔۔۔ لیکن افسانوں اور نظموں کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا قابل کے قدم اکھڑ اکھڑ جاتے تھے۔ اتنے صید تھے کہ سب بوکھلا گئے تھے۔

ایک لیاژاں افسر مجھ سے ملا۔ کہنے لگا "تم کیوں گم سُم رہتے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے مجھے ایک داستان سنائی:

مغویہ عورتوں کی تلاش میں ہم مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں۔ پھر تیسرے گاؤں۔ پھر چوتھے۔ گلی گلی، محلے محلے۔۔۔ کوچے کوچے ۔۔۔ بڑی مشکلوں سے گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے۔

میں نے دل میں کہا "کیسے گوہر... گوہر نا سفتہ ــــ یا سفتہ؟"

"تمہیں معلوم نہیں ہمیں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ... لیکن میں تمہیں ایک بات بتانے والا تھا ... ہم بورڈر کے اس پار سیکڑوں پھیرے کر چکے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ میں نے ہر پھیرے میں ایک بڑھیا کو دیکھا۔ ایک مسلمان بڑھیا کو ... ادھیڑ عمر کی تھی ... پہلی مرتبہ میں نے اسے جالندھر کی بستیوں میں دیکھا۔ پریشان حال، ماؤف دماغ۔ ویران ویران آنکھیں۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال، پھٹے ہوئے کپڑے۔ اسے تن کا ہوش تھا نہ من کا۔ لیکن اس کی نگاہوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

مجھے ــــ بہن نے بتایا کہ یہ عورت صدمے کے باعث پاگل ہو گئی ہے پٹیالہ کی رہنے والی ہے۔ اس کی اکلوتی لڑکی تھی جو اسے نہیں ملتی۔ ہم نے بہت جتن کئے ہیں اسے ڈھونڈھنے کے لئے مگر ناکام رہے ہیں۔ غالباً بلووں میں ماری گئی ہے مگر یہ بڑھیا نہیں مانتی۔

دوسری مرتبہ میں نے اس پگلی کو سہارن پور کے لاریوں کے اڈے پر دیکھا۔ اس کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ ابتر اور خستہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ موٹی موٹی پپڑیاں جمی تھیں۔ بال سادھوؤں کے سے بنے تھے ــــ میں نے اس سے بات چیت کی اور چاہا کہ وہ اپنی موہوم تلاش چھوڑ دے، چنانچہ میں

نے اس غرض سے بہت سنگدل بن کر اس سے کہا "مائی، تیری لڑکی قتل کر دی گئی تھی"۔

پگلی نے میری طرف دیکھا "قتل؟ — نہیں"۔ اس کے لہجے میں فولادی تیقن پیدا ہو گیا"۔ اُسے کوئی قتل نہیں کر سکتا — میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا"۔

اور وہ چلی گئی۔ اپنی موہوم تلاش میں۔

میں نے سوچا "ایک تلاش اور پھر موہوم! — لیکن پگلی کو کیوں اتنا یقین تھا کہ اس کی بیٹی پر کوئی کرپان نہیں اٹھ سکتی۔ کوئی تیز دھار یا کند چھرا اس کی گردن کی طرف نہیں بڑھ سکتا — کیا وہ امر تھی — یا کیا اس کی ممتا امر تھی — ممتا تو خیر امر ہوتی ہے، پھر کیا وہ اپنی ممتا ڈھونڈ رہی تھی — کیا اس نے اسے کہیں کھو دیا....؟"

تیسرے پھیرے پر میں نے اسے پھر دیکھا۔ اب وہ بالکل چیتھڑوں میں تھی۔ قریب قریب ننگی۔ میں نے اس کو کپڑے دیئے مگر اس نے قبول نہ کئے۔

میں نے اس سے کہا "مائی، میں سچ کہتا ہوں، تیری لڑکی پٹیالے ہی میں قتل کر دی گئی تھی"۔

اس نے پھر اسی فولادی تیقن کے ساتھ کہا "تُو جھوٹ کہتا ہے"۔

میں نے اس سے اپنی بات منوانے کی خاطر کہا "نہیں، میں سچ کہتا

ہوں۔ کافی روپیٹ لیا ہے تم نے ___ چلو میرے ساتھ، میں تم کو پاکستان لے چلوں گا۔"

اس نے میری بات نہ سُنی اور بڑبڑانے لگی۔ بڑبڑاتے بڑبڑاتے وہ ایک دم چونکی۔ اب اس کے لہجے میں تیقن فولاد سے بھی زیادہ ٹھوس تھا۔" نہیں ___ میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا!"

میں نے پوچھا۔" کیوں؟"

بڑھیا نے ہولے ہولے کہا۔" وہ خوبصورت ہے ___ اتنی خوبصورت ہے کہ اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا ___ اسے طمانچہ تک نہیں مار سکتا۔"

میں سوچنے لگا۔" کیا واقعی وہ اتنی خوبصورت تھی؟ ___ ہر ماں کی آنکھوں میں اس کی اولاد چندے آفتاب چندے مہتاب ہوتی ہے ___ لیکن ہو سکتا ہے وہ لڑکی درحقیقت خوبصورت ہو ___ مگر اس طوفان میں کونسی خوبصورتی ہے جو انسان کے کھردرے ہاتھوں سے بچی ہے ___ ہو سکتا ہے پگلی اس خیال خام کو دھوکا دے رہی ہو ___ فرار کے لاکھوں راستے ہیں ___ دکھ ایک ایسا چوک ہے جو اپنے اردگرد لاکھوں بلکہ کروڑوں سڑکوں کا جال بُن دیتا ہے ___"

بورڈر کے اس پار کئی پھیرے ہوئے۔ ہر بار میں نے اس پگلی کو دیکھا۔ اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ بینائی کمزور ہو چکی تھی۔ ٹٹول ٹٹول کر چلتی تھی، مگر اس کی تلاش جاری تھی۔ بڑی شدومد سے۔ اس کا یقین اسی طرح مستحکم تھا۔ کہ

اس کی بیٹی زندہ ہے، اس لئے کہ اسے کوئی مار نہیں سکتا۔

—— بہن نے مجھ سے کہا کہ اس عورت سے مغزماری فضول ہے۔ اس کا دماغ چل چکا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اسے پاکستان لے جاؤ اور پاگل خانے میں داخل کرا دو۔

میں نے مناسب نہ سمجھا۔ میں اس کی موہوم تلاش جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھی۔ میں اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے ایک وسیع و عریض پاگل خانے سے جس میں وہ میلوں کی مسافت طے کر کے اپنے پاؤں کے آبلوں کی پیاس بجھا سکتی تھی، اٹھا کر ایک مختصر سی چار دیواری میں قید کرانا نہیں چاہتا تھا۔

آخری بار میں نے اسے امرتسر میں دیکھا۔ اس کی شکستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے پاکستان لے جاؤں گا اور پاگل خانے میں داخل کرا دوں گا۔

وہ فرید کے چوک میں کھڑی، اپنی نیم آندھی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ چوک میں کافی چہل پہل تھی۔ میں —— بہن کے ساتھ ایک دکان پر بیٹھا ایک مغویہ لڑکی کے متعلق بات چیت کر رہا تھا جس کے متعلق ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ بازار صبونیاں میں ایک ہندو بنئے کے گھر موجود ہے۔ یہ گفتگو ختم ہوئی تو میں اٹھا کہ اس پگلی سے جھوٹ سچ کہہ کر اسے پاکستان جانے کے لئے آمادہ کروں۔

کہ ایک جوڑا اودھر سے گذرا ـــــ عورت نے گھونگھٹ کاڑھا ہوا تھا ـــ چھوٹا سا گھونگھٹ۔ اس کے ساتھ ایک سکھ نوجوان تھا۔ بڑا چھیل چھبیلا۔ بڑا تندرست اور تیکھے تیکھے نقشوں والا۔

جب یہ دونوں اس بگلی کے پاس سے گذرے تو نوجوان ایک دم ٹھٹک گیا۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر عورت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کچھ اس اچانک طور پر کہ لڑکی نے اپنا چھوٹا سا گھونگھٹ اٹھایا۔ لیٹھے کی دُھلی ہوئی سفید چادر کے چوکھٹے میں مجھے ایک ایسا گلابی چہرہ نظر آیا جس کا حسن بیان کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

میں ان کے بالکل پاس تھا۔ سکھ نوجوان نے اس حسن و جمال کی دیوی سے اس بگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "تمہاری ماں!"

لڑکی نے ایک لحظے کے لئے بگلی کی طرف دیکھا اور گھونگھٹ چھوڑ لیا اور سکھ نوجوان کا بازو پکڑ کر بھینچے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چلو!"

اور وہ دونوں سڑک سے ذرا ادھر ہٹ کر تیزی سے آگے نکل گئے ـــ بگلی چلائی۔ "بھاگ بھری ـــ بھاگ بھری!"

وہ سخت مضطرب تھی ـــ میں نے پاس جا کر اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے مائی"۔

وہ کانپ رہی تھی۔ "میں نے اس کو دیکھا ہے ـــ میں نے اس کو دیکھا ہے"

میں نے پوچھا "کسے؟"

اس کے ماتھے کے نیچے دو گڑھوں میں اس کی آنکھوں کے بے نور ڈھیلے متحرک تھے "اپنی بیٹی کو ــــ بھاگ بھری کو!"

میں نے پھر اس سے کہا "وہ مر کھپ چکی ہے مائی"۔

اس نے چیخ کر کہا "تم جھوٹ کہتے ہو!"

میں نے اس مرتبہ اس کو پورا یقین دلانے کی خاطر کہا "میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ وہ مر چکی ہے!"

یہ سنتے ہی وہ پگلی چوک ہیں ڈھیر ہو گئی۔

موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ — چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی — رات کو

کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان —— محلّے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا —— غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا —— اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ —— مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لیے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ "نرنجن، یہ ٹھیکے دے کے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اوّل تو یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گذارہ کر لیا کرتا ہے ـــ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا۔ "یار، تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ـــ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں بمبے ہے ـــ بمبے۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ـــ بارہ برس سے۔"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے۔ اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھو منتر ہے ـــ یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ـــ محلّہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لئے تیار تھا

کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لئے اچھا تھا — وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگھر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کے بجائے کھنگھر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی — ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے — کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگھر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک اور لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی۔ وہ گٹھاؤ۔ وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح

مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ —— لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا۔ شاید اس لئے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ —— پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بُری نہیں تھی —— خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزارہا دیئے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے، وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو، گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے

خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوتی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید جبہ پہنے تھی جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں ہیں چوتھائی کے قریب نظر آرہی تھیں۔ بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے۔ مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ — جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چھتوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی — ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آرہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ

اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دونوں ـــــ بڑی بڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں اور . . . جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل ـــــ ساری موذیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔ "یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔" اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خودسر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خطرے میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھُرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں "گوڈے گوڈے"

دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لئے پُر تکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے

ترلوچن بعض اوقات بھنّا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی "تم سکھ ہو —— یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔"

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا "کون سی نازک باتیں —— تمہارے پرانے یاروں کی؟"

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو —— ہاں وہ میرے

یار ہیں ـــــ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔"

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا۔ "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی"

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی۔ "تم سچ مچ سکھ ہو ـــ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ـــ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کرلو ـــــ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔"

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی ـــــ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک

روز جب کہ موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا "موذیل ۔۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو۔"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا۔ "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ــــ "موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ــــ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔"

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔ "تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ــــ تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے ۔۔ تم خوبصورت ہو۔"

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی۔ "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ــــ تم تکلیف نہ کرو۔"

ترلوچن چلایا۔ "موذیل۔"

موذیل دینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں: "خدا کی قسم ــــ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ــــ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ــــ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی"۔

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آگئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ــــ اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کرکے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لئے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے، جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب ڈاڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا: "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی۔" تمہارے بال بہت ملائم ہیں ـــ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ـــ ترلوچ ـــ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لئے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی"۔

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا۔" میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ـــ تم کیوں اڑاتی ہو ـــ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ـــ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ـــ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں"۔

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔" مجھے معلوم ہے"۔

"پھر"۔ ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔" تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ـــ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"مجھے معلوم ہے"۔ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔" میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی"۔

ترلوچن اچھل پڑا۔" سچ؟"

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید

مضبوط دانت ایک لحظے کے لئے چمکے "ہاں!"

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا "تو... تو کب؟"

موذیل الگ ہٹ گئی "جب — تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!"

ترلوچن اس وقت 'جو ہو سو ہو' بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا "میں کل ہی کٹوا دوں گا۔"

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی "تم بکواس کرتے ہو ترلوچ — تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا "تم دیکھ لو گی۔"

"دیکھ لوں گی۔" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "پھوں پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا — وہ کن کن اذیتوں سے گذرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لئے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے اور داڑھی بھی منڈوا دی — یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لئے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیرس پہ تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصّہ اس کے دماغ میں نہ آئے مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چِٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آجائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچ" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔۔۔ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا ۔۔۔ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پہ اس سے کہا "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔"

موذیل پہ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ۔۔۔ ایسے ہی چلتا ہے"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آگیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "شادی کل ہو گی!"

"ضرور۔" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لئے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انہیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل، فورٹ، کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا ــــ ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گذری؟ ــــ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا ــــ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور

اور جو چڑیوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوتی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کدکڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ——— وہ بے حیا تھی، بے مروّت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے، جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انہیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔

وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی "تم سکھ ہو — مجھے تم سے نفرت ہے!"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گذارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی "یہ حیا دیا کیا بکواس ہے — اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو — تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا — یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں — مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو — تم سکھ ہو — مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے — یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے — شرم آنی چاہیئے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا — کرپال کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی، وہ ایسے محلّے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں — لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلّے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری — اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ — بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں — آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا۔ جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی — اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن، پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی — اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"۔

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی — اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں — ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِ عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچ؟" داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو سکرٹ صاف کر سکے — مگر

وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔" بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ـــ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا۔" بیمار رہی ہو؟"

"نہیں۔" موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔" موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔" تم گویا کہ ـــ اب پھر ـــ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔" ہاں!"

"مبارک ہو۔" موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔" کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔" ہاں!"

"مبارک ہو ـــ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں"۔

"یہ بہت بری بات ہے۔" موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔ "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہئے"۔

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے پھیڑا۔ "کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے"؟

"نہیں"۔

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔ "تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی"۔

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، با عصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا — موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے۔ بے وفا ہے۔ بے مروّت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف

اتنا کہا۔" موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ––– جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔" وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ ––– کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟"

"اس کو ابھی تک معلوم نہیں ––– داڑھی میں نے تمہارے دیو لالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی ––– محض انتقامی طور پر ––– اس کے بعد میری، کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں ––– مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے"۔ ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی۔" یہ بہت اچھا ہے . . . . مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے ––– دیکھو، کس زور سے کاٹا ہے۔"

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں

مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی ”کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”ابھی کچھ پتہ نہیں“ یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا ”ترلوچن — تم کیا سوچ رہے ہو؟“

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی ”تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو — جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟“

”مشکل! — موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں — کسی بھی معاملے کی نزاکت — تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو — یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔“

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری ”افسوس بی ڈیمڈ — سلی ایڈیٹ — تم یہ سوچو کہ تمہاری اُس ... کیا نام ہے اس کا ... اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے ... تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے ... تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے — تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو — اور بہت ڈرپوک۔ مجھے نڈر مرد چاہیے ... لیکن چھوڑو

ان باتوں کو . . . چلو آؤ، تمہاری اس کور کو دے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا — ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا "کہاں سے؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے — میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں — چلو آؤ میرے ساتھ۔"

"مگر سُنو تو — کرفیو ہے۔"

"موذیل کے لئے نہیں — چلو آؤ۔"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اُترنے والی تھی کہ رُک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا "یہ تمہاری داڑھی — لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے — ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔"

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔"

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ــــ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔ "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ــــ گدھے کہیں کے . . . . اس کی جان کا سوال ہے ــــ کیا نام ہے تمہاری اس کور کا، جس سے تم محبت کرتے ہو۔"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے ــــ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔"

موذیل چڑ گئی۔ "اوہ، تمہاری محبت بی ڈیمڈ ــــ میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں ــــ اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے ــــ اور شاید وہ اپنا انڈر ویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔"

ترلوچن نے کہا۔ "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو ــــ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ــــ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے۔"

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں ــــ اگر میں تمہارے

ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا — میں اپنی محبّت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں "گدھے — تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے — تمہاری وہ — کیا نام ہے اس بھڑوی کا — جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا — تم سکھ ہو — خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچن بھنا گیا "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا "ڈارلنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی — جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا "تم کپڑے نہیں پہنو گی!"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا "نہیں — چلے گا اسی طرح"۔

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی

اس نے کپڑے تبدیل کیئے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پہ جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تکڑی ٹانگیں چوڑی کیئے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصّے میں کہا "تم بہت ذلیل ہو"۔

موذیل مسکرائی۔ "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ــــ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں"۔ پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے ــــ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں"

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹرامیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پہ کوئی انسان گذرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات

کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ "اے — کدھر جا رہا ہے"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔ "اوہ، تم — ہم کو پہچانا نہیں تم نے — موذیل . . ." پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر اس باجو — ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے — ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے . . ."

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر اس کو دیا۔ "لو پیو —"

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا۔ "ہیر از لائٹ!"

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں

آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی — جس میں سے گذر کر انہیں — محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرپنیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرّت محسوس کر رہی ہے — خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا "ترلوچ ڈیئر — اس طرح ڈرنا اچھا نہیں — تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا — سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے"!

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے۔ جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی، جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی — کچھ فاصلے پر

بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحظے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا "کوئی بات نہیں — چلو آؤ۔"

دونوں چلنے لگے — ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا — کہ موذیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا "اے کیا کرتا ہے — اپنے بھائی کو مارتا ہے — ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔" پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی "کریم — اٹھاؤ، یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔"

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا "عیش کر سالی — عیش کر۔" پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا "کوئی ذلیل حرکت نہیں —

سب چلتا ہے . . . آؤ۔"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی ــــ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا۔ "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "تیسری گلی میں ــــ نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ــــ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔" موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ "ترلوچ ڈیئر ــــ یہ پگڑی اتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا۔ "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ "تمہاری مرضی ــــ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے؟"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ــــ صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی

پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا "دیکھو، ایسا کرو ــ میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ــ تم میرے پیچھے آنا ــ بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو سمجھے ــ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔"

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے ــ سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا "کون سا مالا؟"

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری "دوسرا۔"

"چلو۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی "مہنگا سنگھ جی ——— مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا ——— ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی دونوں اندر داخل ہوئے ——— موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ——— جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لئے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔ "ڈرو نہیں، ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے۔"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ——— اور اپنی ماتا جی سے بھی ——— لیکن جلدی کرو۔"

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔ "اسے پکڑ لیا انہوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا۔ "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ــــــ تم یہ کپڑے اتارو"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی باہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا آزار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی۔ "جاؤ، اسے لے جاؤ ــــ لیکن ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا۔ "جاؤ۔ ــــ جلدی نکل جاؤ۔"

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "آؤ۔" مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی باہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"

"جہنم میں جائیں وہ — تم اسے لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں آجاؤں گی۔"

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر انہوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔ کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا: "سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے — میں دروازہ کھولتی ہوں . . . ."

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی: "دروازہ۔"

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی: "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں — تم میرے پیچھے بھاگنا — میں اوپر چڑھ جاؤں گی — تم بھی اوپر چلے آنا — یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے . . . ."

ترلوچن نے پھر پوچھا۔ "پھر؟"

موذیل نے کہا۔ "یہ تمہاری ——— کیا نام ہے اس کا ——— موقعہ پاکر نکل جائے ——— اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری ——— سب بوکھلا گئے اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی ——— کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی ——— وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا ——— اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی۔ ——— پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اردگرد جمع ہو گئے ——— کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی۔"موذیل — موذیل"۔

موذیل نے اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا۔"جاؤ، دیکھو — میرا انڈر ویئر وہاں ہے کہ نہیں — میرا مطلب ہے وہ ..."

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا۔"تم سچ مچ سکھ ہو ... جاؤ دیکھ کر آؤ"۔

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا۔" یہ میاں بھائی ہے ... لیکن بہت دادا قسم کا ... میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں"۔

ترلوچن واپس آگیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے ... موذیل نے اطمینان کا سانس لیا — لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا۔" اوہ ڈیم اٹ ..." یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔"آل رائٹ ڈارلنگ — بائی بائی"۔

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی "لے جاؤ اس کو ——— اپنے اس مذہب کو۔" اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

صاحبِ کرامات

چوہدری موجو بوڑھے برگد کی گھنی چھاؤں کے نیچے کھرّی چارپائی پر بڑے
اطمینان سے بیٹھا اپنا چموڑا پی رہا تھا۔ دھوئیں کے ہلکے ہلکے بلّقے اس کے منہ
سے نکلتے تھے اور دوپہر کی ٹھہری ہوئی ہوائیں ہولے ہولے گم ہو جاتے تھے۔

وہ صبح سے اپنے چھوٹے سے کھیت میں ہل چلاتا رہا تھا اور اب تھک
گیا تھا۔ دھوپ اس قدر تیز تھی کہ چیل بھی اپنا انڈا چھوڑ دے مگر اب وہ اطمینان
سے بیٹھا اپنے چموڑے کا مزا لے رہا تھا جو چٹکیوں میں اس کی تھکن دور کر دیتا تھا
اس کا پسینہ خشک ہو گیا تھا۔ اس لئے ٹھہری ہوا اسے کوئی ٹھنڈک نہیں
پہنچا رہی تھی مگر چموڑے کا ٹھنڈا ٹھنڈا لذیذ دھواں اس کے دل و دماغ میں
ناقابلِ بیان سرور کی لہریں پیدا کر رہا تھا۔

اب وقت ہو چکا تھا کہ گھر سے اس کی اکلوتی لڑکی جیناں روٹی لسی لے کر آ جائے۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتی تھی۔ حالانکہ گھر میں اس کا ہاتھ بٹانے والا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں تھی جس کو دو سال ہوئے موجو نے ایک طویل جھگڑے کے بعد انتہائی غصے میں طلاق دے دی تھی۔

اس کی جوان اکلوتی بیٹی جیناں بڑی فرماں بردار لڑکی تھی۔ وہ اپنے باپ کا بہت خیال رکھتی تھی۔ گھر کا کام کاج جو اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بڑی مستعدی سے کرتی تھی کہ جو خالی وقت ملے اس میں چرخہ چلائے اور پونیاں کاتے۔ یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ جو گنتی کی تھیں ادھر ادھر کی خوش گپیوں میں گذار دے۔

چوہدری موجو کی زمین واجبی تھی مگر اس کے گذارے کے لئے کافی تھی۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا۔ ایک دور افتادہ جگہ پر جہاں سے ریل کا گذر نہیں تھا۔ ایک کچی سڑک تھی جو اسے دور ایک بڑے گاؤں کے ساتھ ملاتی تھی۔ چوہدری موجو ہر مہینے دو مرتبہ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اس گاؤں میں جاتا تھا۔ جس میں دو تین دکانیں تھیں اور ضرورت کی چیزیں لے آتا تھا۔

پہلے وہ بہت خوش تھا۔ اس کو کوئی غم نہیں تھا۔ دو تین برس اس کو اس خیال نے البتہ ضرور ستایا تھا کہ اس کے کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوتی، مگر پھر وہ یہ سوچ کر شاکر ہو گیا تھا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے ــــ مگر اب جس دن سے اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر میکے رخصت کر دیا تھا۔ اس کی

زندگی سوکھا ہوا اینچہ سی بن کے رہ گئی تھی۔ ساری طراوت جیسے اس کی بیوی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

چوہدری موجو مذہبی آدمی تھا۔ حالانکہ اسے اپنے مذہب کے متعلق صرف دو تین چیزوں ہی کا پتہ تھا کہ خدا ایک ہے جس کی پرستش لازمی ہے۔ محمدؐ اس کے رسول ہیں جن کے احکام ماننا فرض ہے اور قرآن پاک خدا کا کلام ہے جو محمدؐ پر نازل ہوا اور بس۔

نماز روزے سے وہ بے نیاز تھا۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا جس میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ دس پندرہ گھر تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے دور دور۔ لوگ اللہ اللہ کرتے تھے۔ ان کے دل میں اس ذات پاک کا خوف تھا مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ قریب قریب ہر گھر میں قرآن موجود تھا۔ مگر پڑھنا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سب نے اسے احتراماً جزدان میں لپیٹ کر کسی اونچے طاق میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کی ضرورت صرف اسی وقت پیش آتی تھی۔ جب کسی سے کوئی سچی بات کہلوانی ہوتی تھی یا کسی کام کے لئے حلف اٹھوانا ہوتا تھا۔

گاؤں میں مولوی کی شکل اسی وقت دکھائی دیتی تھی جب کسی لڑکے یا لڑکی کی شادی ہوتی تھی۔ مرگ پر جنازہ وغیرہ وہ خود ہی پڑھ لیتے تھے۔ اپنی زبان میں۔

چوہدری موجو ایسے موقعوں پر زیادہ کام آتا تھا اس کی زبان میں اثر تھا۔

جس انداز سے وہ مرحوم کی خوبیاں بیان کرتا تھا اور اس کی مغفرت کے لئے دعا کرتا تھا۔ وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔

پچھلے برس جب اس کے دوست دینو کا جوان لڑکا مرگیا تو اس کو قبر میں اتار کر اس نے بڑے مؤثر انداز میں یہ کہا تھا، ہائے، کیا شیں جوان لڑکا تھا۔ تھوک پھینکتا تھا تو بیس گز دور جا کے گرتی تھی۔ اس کی پیشاب کی دھار کا تو آس پاس کے کسی گاؤں کھیڑے میں بھی مقابلہ کرنے والا موجود نہیں تھا اور بینی پکڑنے میں تو جواب نہیں تھا اس کا ـــ ہیے گھسنی کا نعرہ مارتا اور دو انگلیوں سے یوں بینی کھولتا جیسے کرتے کا بٹن کھولتے ہیں ـــ دینو یار، تجھ پر آج قیامت کا دن ہے۔ ۔ ۔ ۔ تُو کبھی یہ صدمہ نہیں برداشت کرے گا ـــ یار دا اسے مرجانا چاہئے تھا ـــ ایسا شیں جوان لڑکا۔ ـــ ایسا خوبصورت گبرو جوان ـــ نیتی سنیاری جیسی سندر اور ہٹیلی ناری اس کو قابو کرنے کے لئے تعویذ دھاگے کراتی رہی ـــ مگر بھئی مرحبا ہے دینو، تیرا لڑکا لنگوٹ کا پکا رہا ـــ خدا کرے اس کو جنت میں سب سے خوبصورت حور ملے اور وہاں بھی لنگوٹ کا پکا رہے۔ اللہ میاں خوش ہو کر اس پہ اپنی اور رحمتیں نازل کرے گا ـــ آمین"۔

یہ چھوٹی سی تقریر سن کر دس بیس آدمی جن میں دینو بھی شامل تھا ڈھاریں مار مار کر رو پڑے تھے۔ خود چوہدری موجو کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

موجو نے جب اپنی بیوی پھاتاں کو طلاق دینا چاہی تھی تو اس نے مولوی بلانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ تین مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق کہہ دو تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ قصہ اس طرح ختم کیا تھا، مگر دوسرے ہی دن اس کو بہت افسوس ہوا تھا۔ بڑی ندامت ہوئی تھی کہ اس نے یہ کیا غلطی کی۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مگر طلاق تک نوبت نہیں آتی۔ اس کو درگذر کرنا چاہئے تھا۔

پھاتاں اس کو پسند تھی۔ گو وہ اب جوان نہیں تھی، لیکن پھر بھی اس کو اس کا جسم پسند تھا۔ اس کی باتیں پسند تھیں — اور پھر وہ اس کی جیناں کی ماں تھی — مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا جو واپس نہیں آسکتا تھا۔ چوہدری موجو جب بھی اس کے متعلق سوچتا تو اس کے چھینتے حموڑے کا دھواں اس کے حلق میں تلخ گھونٹ بن بن کے جانے لگتا۔

جیناں خوبصورت تھی۔ اپنی ماں کی طرح۔ ان دو برسوں میں اس نے ایک دم بڑھنا شروع کر دیا تھا اور دیکھتے دیکھتے جوان مٹیار بن گئی تھی جس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ پھوٹ کے نکل رہی تھی۔ چوہدری موجو کو اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی تھی۔ یہاں پھر اس کو پھاتاں یاد آتی۔ یہ کام وہ کتنی آسانی سے کر سکتی تھی۔

کھری کھاٹ پر چوہدری موجو نے اپنی نشست اور اپنا تہمد درست کرتے

ہوئے چموڑے سے غیر معمولی لمبا کش لیا اور کھانسنے لگا۔ کھانسنے کے دوران میں کسی کی آواز آئی "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔

چوہدری موجو نے پلٹ کر دیکھا تو اسے سفید کپڑوں میں ایک دراز ریش بزرگ نظر آئے۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص کہاں سے آگیا ہے۔

دراز ریش بزرگ کی آنکھیں بڑی بڑی اور بارعب تھیں جن میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ لمبے لمبے پٹے تھے۔ ان کے اور داڑھی کے بال کھچڑی تھے۔ سفید زیادہ اور سیاہ کم۔ سر پر سفید عمامہ تھا۔ کاندھے پر ریشم کا کاڑھا ہوا بسنتی رومال۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والا موٹا عصا تھا۔ پاؤں میں لال کھال کا نرم و نازک جوتا۔

چوہدری موجو نے جب اس بزرگ کا سراپا غور سے دیکھا۔ تو اس کے دل میں فوراً ہی اس کا احترام پیدا ہو گیا۔ چارپائی پر سے جلدی جلدی اٹھ کر وہ اس سے مخاطب ہوا "آپ کہاں سے آئے، کب آئے؟"

بزرگ کی گنری ہوئی شرعی لبوں میں مسکراہٹ پیدا ہوئی "فقیر کہاں سے آئیں گے۔ ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ان کے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے جدھر حکم دیا چل پڑے جہاں ٹھہرنے کا حکم ہوا وہیں ٹھہر گئے"۔

چوہدری موجو پر ان الفاظ کا بہت اثر ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس

بزرگ کا ہاتھ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ چوما، آنکھوں سے لگایا۔

"چوہدری موجو کا گھر آپ کا اپنا گھر ہے۔"

بزرگ مسکراتا ہوا کھاٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے چاندی کی موٹھ والے عصا کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس پر اپنا سر جھکا دیا۔ "اللہ جل شانہٗ کو جانے تیری کون سی ادا پسند آگئی کہ اپنے اس حقیر اور عاصی بندے کو تیرے پاس بھیج دیا۔"

چوہدری موجو نے خوش ہو کر پوچھا۔ "تو مولوی صاحب آپ اس کے حکم سے آئے ہیں؟"

مولوی صاحب نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور کسی قدر خشم آلود لہجے میں کہا۔ "تو کیا ہم تیرے حکم سے آئے ہیں ـــ ہم تیرے بندے ہیں یا اس کے جس کی عبادت میں ہم نے پورے چالیس برس گذار کر یہ تھوڑا بہت رتبہ حاصل کیا ہے۔"

چوہدری موجو کانپ گیا۔ اپنے مخصوص گنوار لیکن پر خلوص انداز میں اس نے مولوی صاحب سے اپنی تقصیر معاف کرائی اور کہا۔ "مولوی صاحب، ہم جیسے انسانوں سے جن کو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں ـــ ہم گنہگار ہیں۔ ہمیں بخشوانا اور بخشنا آپ کا کام ہے۔"

مولوی صاحب نے اپنی بڑی بڑی سرمہ لگی آنکھیں بند کیں اور کہا۔ "ہم اسی لئے آئے ہیں۔"

چوہدری موجو زمین پر بیٹھ گیا اور مولوی صاحب کے پاؤں دبانے لگا۔ اتنے

میں اس کی لڑکی جیناں آگئی۔ اس نے مولوی صاحب کو دیکھا تو گھونگھٹ چھوڑ لیا۔

مولوی صاحب نے مُندی آنکھوں سے پوچھا "کون ہے چوہدری موجو؟"

"میری بیٹی مولوی صاحب ۔۔۔ جیناں!"

مولوی صاحب نے نیم وا آنکھوں سے جیناں کو دیکھا اور موجو سے کہا "ہم فقیروں سے کیا پردہ ہے ۔۔۔ اس سے پوچھو۔"

"کوئی پردہ نہیں مولوی صاحب ۔۔۔ پردہ کیسا ہوگا۔" پھر موجو جیناں سے مخاطب ہوا۔ "یہ مولوی صاحب ہیں جیناں۔ اللہ کے خاص بندے ۔۔۔ ان سے پردہ کیسا۔ اٹھا لے اپنا گھونگھٹ!"

جیناں نے اپنا گھونگھٹ اٹھا لیا۔ مولوی صاحب نے اپنی سرمہ لگی نظریں بھر کے اس کی طرف دیکھا اور موجو سے کہا "تیری بیٹی خوبصورت ہے چوہدری موجو!"

جیناں شرما گئی۔ موجو نے کہا "اپنی ماں پر ہے مولوی صاحب!"

"کہاں ہے اس کی ماں"۔ مولوی صاحب نے ایک بار پھر جیناں کی جوانی کی طرف دیکھا۔

چوہدری موجو سٹپٹا گیا کہ جواب کیا دے۔

مولوی صاحب نے پھر پوچھا "اس کی ماں کہاں ہے چوہدری موجو؟"

موجو نے جلدی سے کہا "مر چکی ہے جی!"

مولوی صاحب کی نظریں جیناں پر گڑی تھیں۔ اس کا ردِ عمل بھانپ کر انہوں

نے موجو سے کڑک کر کہا "تو جھوٹ بولتا ہے"۔

موجو نے مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لئے اور ندامت بھری آواز میں کہا "جی ہاں ــــ جی ہاں ــــ میں نے جھوٹ بولا تھا ــــ مجھے معاف کر دیجئے ــــ میں بڑا جھوٹا آدمی ہوں ــــ میں نے اس کو طلاق دے دی تھی مولوی صاحب"۔

مولوی صاحب نے ایک لمبی 'ہوں' کی اور نظریں جیناں کی چدریا سے ہٹالیں اور موجو سے مخاطب ہوئے "تو بہت بڑا گناہگار ہے ــــ کیا قصور تھا اس بے زبان کا؟"

موجو ندامت میں غرق تھا۔ "کچھ نہیں معلوم مولوی صاحب ــــ معمولی سی بات تھی جو بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی ــــ میں واقعی گنہگار ہوں ــــ طلاق دینے کے دوسرے دن ہی میں نے سوچا تھا کہ موجو تو نے یہ کیا جھک ماری ــــ پر اس وقت کیا ہو سکتا تھا ــــ چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں ــــ پچھتاوے سے کیا ہو سکتا تھا مولوی صاحب"۔

مولوی صاحب نے چاندی کی موٹھ والا عصا موجو کے کاندھے پر رکھ دیا۔ "اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات بہت بڑی ہے۔ وہ بڑا رحیم ہے، بڑا کریم ہے ــــ وہ چاہے تو ہر بگڑی بنا سکتا ہے ــــ اس کا حکم ہوا تو یہ حقیر فقیر ہی تیری نجات کے لئے کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گا"۔

ممنون و متشکر چوہدری موجو مولوی صاحب کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گیا اور رونے لگا۔ مولوی صاحب نے جیناں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی اشک

رواں تھے "۔ "ادھر آ لڑکی"۔

مولوی صاحب کے لہجے میں ایسا حکم تھا جس کو رد کرنا جیناں کے لئے ناممکن تھا روٹی اور لسی ایک طرف رکھ کر وہ کھاٹ کے پاس چلی گئی۔ مولوی صاحب نے اس کو بازو سے پکڑا اور کہا "بیٹھ جا"۔

جیناں زمین پر بیٹھنے لگی تو مولوی صاحب نے اس کا بازو اوپر کھینچا "ادھر میرے پاس بیٹھ"

جیناں سمٹ کر مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر اس کو اپنے قریب کر لیا اور ذرا دبا کر پوچھا "کیا لائی ہے تو ہمارے کھانے کے لئے"۔

جیناں نے ایک طرف ہٹنا چاہا مگر گرفت مضبوط تھی۔ اس کو جواب دینا پڑا۔

"جی — جی روٹیاں ہیں۔ ساگ ہے اور لسی"۔

مولوی صاحب نے جیناں کی پتلی مضبوط کمر اپنے ہاتھ سے ایک بار پھر دبائی "چل کھول کھانا اور ہمیں کھلا"۔

جیناں اٹھ کر چلی گئی تو مولوی صاحب نے موجو کے کندھے سے اپنا چاندی کی موٹھ والا عصا ننھی سی ضرب کے بعد اٹھا لیا "اٹھ موجو — ہمارے ہاتھ دھلا"۔

موجو فوراً اٹھا۔ پاس ہی کنواں تھا۔ پانی لایا اور مولوی صاحب کے ہاتھ بڑے مریدانہ طور پر دھلائے۔ جیناں نے چارپائی پر کھانا رکھ دیا۔

مولوی صاحب سب کا سب کھا گئے اور جیناں کو حکم دیا کہ وہ ان کے ہاتھ

دھلاتے۔ جیناں عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ مولوی صاحب کی شکل وصورت اور ان کی گفتگو کا انداز ہی کچھ ایسا "محکم" بھرا تھا۔

مولوی صاحب نے ڈکارے کر بڑے زور سے الحمدللہ کہا۔ داڑھی پر گیلا گیلا ہاتھ پھیرا۔ ایک اور ڈکار لی اور چارپائی پر لیٹ گئے اور ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے جیناں کی ڈھلکی ہوئی چدریا کی طرف دیکھتے رہے۔ اس نے جلدی جلدی برتن سمیٹے اور چلی گئی۔ مولوی صاحب نے آنکھ بند کی اور موجو سے کہا۔ "چوہدری اب ہم سوئیں گے"

چوہدری کچھ دیر ان کے پاؤں دابتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ سو گئے ہیں تو ایک طرف جا کر اس نے اپلے سلگائے اور چلم میں تمباکو بھر کے بھوکے پیٹ حقہ پینا شروع کر دیا۔ مگر وہ خوش تھا۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا کوئی بہت بڑا بوجھ دور ہو گیا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے مخصوص گنوار مگر مخلص انداز میں اللہ تعالٰی کا شکر ادا کیا جس نے اپنی جناب سے مولوی صاحب کی شکل میں فرشتۂ رحمت بھیج دیا۔

پہلے اس نے سوچا کہ مولوی صاحب کے پاس ہی بیٹھا رہے کہ شاید ان کو کسی خدمت کی ضرورت ہو، مگر جب دیر ہو گئی اور وہ سوتے رہے، تو وہ اٹھ کر اپنے کھیت میں چلا گیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کو اس بات کا قطعاً خیال نہیں تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ اس کو بلکہ اس بات کی بے حد مسرت تھی کہ اس کا کھانا مولوی صاحب نے کھایا اور اس کو اتنی بڑی سعادت ہوئی۔

شام سے پہلے پہلے جب وہ کھیت سے واپس آیا تو اس کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ

ہُوا کہ مولوی صاحب موجود نہیں۔ اس نے خود کو بڑی لعنت ملامت کی کہ وہ کیوں چلا گیا۔ اُن کے حضور بیٹھا رہتا۔ شاید وہ ناراض ہو کر چلے گئے ہوں اور کوئی بددعا بھی دے گئے ہوں۔ جب چوہدری موجو نے یہ سوچا تو اس کی سادہ رُوح لرز گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے ادھر ادھر مولوی صاحب کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملے۔ گہری شام ہو گئی، پھر بھی ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تھک ہار کر اپنے کو دل ہی دل میں کوستا اور لعنت ملامت کرتا۔ وہ گردن جھکائے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اسے دو جوان لڑکے گھبرائے ہوئے ملے۔ چوہدری موجو نے ان سے گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو انہوں نے پہلے تو ٹالنا چاہا، مگر پھر اصل بات بتا دی کہ وہ کھوہ میں دبا ہوا شراب کا گھڑا نکال کر پینے والے تھے کہ ایک نورانی صورت والے بزرگ ایک دم وہاں نمودار ہو گئے اور بڑی غضب ناک نگاہوں سے ان کو دیکھ کر یہ پوچھا کہ وہ یہ کیا حرام کاری کر رہے ہیں۔ جس چیز کو اللہ تبارک تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے وہ اسے پی کر اتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں جس کا کوئی کفارہ ہی نہیں۔ ان لوگوں کی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ کچھ بولیں۔ بس سر پر پاؤں رکھ کے بھاگے اور یہاں آ کے دم لیا۔

چوہدری موجو نے ان دونوں کو بتایا کہ وہ نورانی صورت والے واقعی اللہ کو پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ پھر اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اب جانے اس گاؤں پہ کیا قہر نازل ہو گا۔ ایک اس نے ان کو چھوڑ کر چلے جانے کی بُری حرکت کی، ایک

انہوں نے کہ حرام شئے نکال کر پی رہے تھے۔

"اب اللہ ہی بچائے ___ اب اللہ ہی بچائے میرے بچو۔" یہ بڑبڑاتا چوہدری موجو گھر کی جانب روانہ ہوا جیناں موجود تھی، پر اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور خاموش کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس پر اور گاؤں پر ضرور کوئی خدائی آفت آئے گی۔

شام کا کھانا تیار تھا۔ جیناں نے مولوی صاحب کے لئے بھی پکا رکھا تھا۔ جب اس نے اپنے باپ سے پوچھا کہ مولوی صاحب کہاں ہیں تو اس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "گئے ___ چلے گئے۔ ان کا ہم گنہگاروں کے ہاں کیا کام!"

جیناں کو افسوس ہوا کیونکہ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ وہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ نکالیں گے جس سے اس کی ماں واپس آجائے گی ___ پر وہ جا چکے تھے ___ اب وہ راستہ ڈھونڈنے والا کون تھا۔ جیناں خاموشی سے پیڑھی پر بیٹھ گئی ___ کھانا ٹھنڈا ہوتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈیوڑھی میں آہٹ ہوئی۔ باپ بیٹی دونوں چونکے۔ موجو اٹھ کے باہر گیا اور چند لمحات میں مولوی صاحب دونوں اندر صحن میں تھے۔ دیئے کی دھندلی روشنی میں جیناں نے دیکھا کہ مولوی صاحب لڑکھڑا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مٹکا ہے۔

موتو جو نے ان کو سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا۔ مولوی صاحب نے گھڑا موتو جو کو دیا اور لکنت بھرے لہجے میں کہا۔ "آج خدا نے ہمارا بہت کڑا امتحان لیا۔ تمہارے گاؤں کے دو لڑکے شراب کا گھڑا نکال کر پینے والے تھے کہ ہم پہنچ گئے ـــــ وہ ہمیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ ہم کو بہت صدمہ ہوا کہ اتنی چھوٹی عمر اور اتنا بڑا گناہ۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اسی عمر میں تو انسان رستے سے بھٹکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ان کا گناہ معاف کیا جائے۔۔
جواب ملا ـــــ جانتے ہو کیا جواب ملا؟"

موتو جو نے لرزتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں!"

"جواب ملا ـــ کیا تو ان کا گناہ اپنے سر لیتا ہے ـــ میں نے عرض کی۔ ہاں باری تعالیٰ ـــ آواز آئی، تو جا یہ سارا گھڑا شراب کا تو پی ـــ ہم نے ان لڑکوں کو بخشا!"

موتو جو ایک ایسی دنیا میں چلا گیا جو اس کے اپنے تخیل کی پیداوار تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "تو آپ نے پی۔"

مولوی صاحب کا لہجہ اور زیادہ لکنت بھرا ہو گیا۔ "ہاں پی ـــ پی ـــ ان کا گناہ اپنے سر لینے کے لئے پی ـــ رب العزت کی آنکھوں میں سرخرو ہونے کے لئے پی ـــ گھڑے میں اور بھی پڑی ہے ـــ یہ بھی ہمیں پینی ہے ـــ رکھ دے اسے سنبھال کے اور دیکھ اس کی ایک بوند ادھر ادھر نہ ہو۔"

موجو نے گھڑا اٹھا کر اندر کوٹھڑی میں رکھ دیا اور اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ واپس صحن میں آیا تو مولوی صاحب جیناں سے اپنا سر دبوا رہے تھے اور اس سے کہہ رہے تھے۔ "جو آدمی دوسروں کے لئے کچھ کرتا ہے، اللہ جل شانہٗ اس سے بہت خوش ہوتا ہے —— وہ اس وقت تجھ سے بھی خوش ہے —— ہم بھی تجھ سے خوش ہیں۔"

اور اسی خوشی میں مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اس کو اپنے گلے سے لگا لیا اور موجو سے کہا۔ "چوہدری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اٹھا ہے۔"

چوہدری سرتاپا ممنون و متشکر تھا۔ "یہ سب آپ کی دعا ہے —— آپ کی مہربانی ہے۔"

مولوی صاحب نے جیناں کو ایک مرتبہ پھر اپنے سینے کے ساتھ بھینچا۔ "اللہ مہربان سو کل مہربان —— جیناں ہم تجھے ایک وظیفہ بتائیں گے۔ وہ پڑھا کرنا۔ اللہ ہمیشہ مہربان رہے گا۔"

دوسرے دن مولوی صاحب بہت دیر سے اٹھے۔ موجو ڈر کے مارے کھیتوں پر نہ گیا۔ صحن میں ان کی چارپائی کے پاس بیٹھا رہا۔ جب وہ اٹھے تو ان کو مسواک کرائی، نہلایا دھلایا —— اور ان کے ارشاد کے مطابق شراب کا گھڑا لا کر ان کے

پاس رکھ دیا۔ مولوی صاحب نے کچھ پڑھا۔ گھڑے کا منہ کھول کر اس میں تین بار پھونکا اور دو تین کٹورے چڑھا گئے۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ کچھ پڑھا اور بلند آواز میں کہا "ہم تیرے ہر امتحان میں پورے اتریں گے مولا"۔ پھر وہ چوہدری سے مخاطب ہوئے "موجو جا ــــ حکم ملا ہے کہ ابھی جا اور اپنی بیوی کو لے آ ــــ راستہ مل گیا ہے ہمیں"۔

موجو بہت خوش ہوا۔ جلدی جلدی اس نے گھوڑی پر زین کسی اور کہا کہ وہ دوسرے روز صبح سویرے پہنچ جائے گا۔ پھر اس نے جیناں سے کہا کہ وہ مولوی صاحب کی ہر آسائش کا خیال رکھے اور خدمت گذاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔

جیناں برتن مانجھنے میں مشغول ہو گئی۔ مولوی صاحب چارپائی پر بیٹھے اسے گھورتے اور شراب کے کٹورے پیتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے جیب سے موٹے موٹے دانوں والی تسبیح اٹھائی اور پھیرنا شروع کر دی۔ جب جیناں کام سے فارغ ہو گئی تو انہوں نے اس سے کہا "جیناں دیکھو ــــ وضو کرو"۔

جیناں نے بڑے بھولپن سے جواب دیا "مجھے نہیں آتا مولوی جی"۔

مولوی صاحب نے بڑے پیار سے اس کو سرزنش کی "وضو کرنا نہیں آتا ــــ کیا جواب دے گی اللہ کو"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اس کو وضو کرایا اور ساتھ ساتھ اس انداز سے سمجھاتے رہے کہ وہ اس کے بدن کے ایک ایک کونے کھدرے کو جھانک کر دیکھ سکیں۔

وضو کرانے کے بعد مولوی صاحب نے جانماز مانگی۔ وہ نہ ملی تو پھر ڈانٹا، مگر

اسی انداز میں۔ کھیس منگوایا اس کو اندر کی کوٹھری میں بچھایا اور جیناں سے کہا کہ باہر کی کنڈی لگا دے۔ جب کنڈی لگ گئی تو اس سے کہا کہ گھڑا اور کٹورا اٹھا کے اندر لے آئے۔ وہ لے آئی۔ مولوی صاحب نے آدھا کٹورا پیا اور آدھا اپنے سامنے رکھ لیا اور تسبیح پھیرنا شروع کر دی جیناں ان کے پاس خاموش بیٹھی رہی۔

بہت دیر تک مولوی صاحب آنکھیں بند کیئے اسی طرح وظیفہ کرتے رہے، پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ کٹورا جو آدھا بھرا تھا، اس میں تین پھونکیں ماریں اور جیناں کی طرف بڑھا دیا۔ "پی جاؤ اسے۔"

جیناں نے کٹورا پکڑ لیا مگر اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ مولوی صاحب نے بڑے جلال بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا "ہم کہتے ہیں، پی جاؤ ــــ تمہارے سارے ولدّر دور ہو جائیں گے۔"

جیناں پی گئی، مولوی صاحب اپنی پتلی لبوں میں مسکرائے اور اس سے کہا "ہم پھر اپنا وظیفہ شروع کرتے ہیں ــ جب شہادت کی انگلی سے اشارہ کریں تو آدھا کٹورہ گھڑے سے نکال کر فوراً پی جانا ــ سمجھ گئیں۔"

مولوی صاحب نے اس کو جواب کا موقعہ ہی نہ دیا اور آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے ــ جیناں کے منہ کا ذائقہ بے حد خراب ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سینے میں آگ سی لگ گئی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیئے۔ پر وہ کیسے اٹھ سکتی تھی۔ جلن کو حلق اور سینے میں لئے دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کے بعد ایک دم

مولوی صاحب کی شہادت کی انگلی زور سے اٹھی۔ جیناں کو جیسے کسی نے ہپناٹزم کر دیا تھا۔ فوراً اس نے آدھا کٹورا بھرا اور پی گئی۔ تھوکنا چاہا مگر اٹھ نہ سکی۔

مولوی صاحب اسی طرح آنکھیں بند کئے تسبیح کے دانے کھٹا کھٹ پھیرتے رہے۔ جیناں نے محسوس کیا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے اور جیسے اس کو نیند آ رہی ہے پھر اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یوں محسوس کیا کہ وہ کسی بے داڑھی مونچھ والے جوان مرد کی گود میں ہے اور وہ اسے جنت دکھانے لے جا رہا ہے۔

جیناں نے جب آنکھیں کھولیں تو وہ کھیس پر لیٹی تھی۔ اس نے نیم وا مخمور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور یہاں کیوں لیٹی تھی، کب لیٹی تھی کے متعلق سوچنا شروع کیا تو اسے سب کچھ دھند میں لپٹا نظر آیا۔ وہ پھر سونے لگی۔ لیکن ایک دم اٹھ بیٹھی۔ مولوی صاحب کہاں تھے؟ ۔۔۔ اور وہ جنت؟

کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ باہر صحن میں نکلی تو دیکھا کہ دن ڈھل رہا ہے اور مولوی صاحب گھڑے کے پاس بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ آہٹ سن کر انہوں نے پلٹ کر جیناں کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ جیناں واپس کوٹھڑی میں چلی گئی اور کھیس پر بیٹھ کر اپنی ماں کے متعلق سوچنے لگی جس کو لانے اس کا باپ گیا ہوا تھا ۔۔۔ پوری ایک رات باقی تھی ان کی واپسی میں۔

اور اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کچھ پکایا یا ریندھا نہیں تھا۔

اس کے چھوٹتے ہی مضطرب دماغ میں بے شمار باتیں آرہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب نمودار ہوئے اور یہ کہہ کر چلے گئے۔

"مجھے تمہارے باپ کے لئے ایک وظیفہ کرنا ہے ــــ ساری رات کسی قبر کے پاس بیٹھنا ہوگا ــــ صبح آجاؤں گا ــــ تمہارے لئے بھی دعا مانگوں گا۔"

مولوی صاحب صبح سویرے نمودار ہوئے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں سرمے کی تحریر غائب تھی بے حد سرخ تھیں۔ ان کے لہجے میں لکنت تھی اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ۔ صحن میں آتے ہی انہوں نے مسکرا کر جیناں کی طرف دیکھا آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگایا۔ اس کو چوما اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جیناں ایک طرف کونے میں پیڑھی پر بیٹھ گئی اور گذشتہ دھندلے واقعات کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کو اپنے باپ کا بھی انتظار تھا جس کو اس وقت تک پہنچ جانا چاہئے تھا ماں سے بچھڑے ہوئے اس کو دو برس ہو چکے تھے . . . . اور جنت . . . وہ جنت . . . . کیسی تھی وہ جنت !! ــــ کیا وہ مولوی صاحب تھے ؟ ــــ مگر اس کو دھندلا سا خیال تھا کہ وہ آدمی داڑھی والا نہیں تھا۔ کوئی جوان تھا۔

مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد اس سے مخاطب ہوئے۔ "جیناں، ابھی تک موجو نہیں آیا۔"

جیناں خاموش رہی۔

مولوی صاحب پھر اس سے مخاطب ہوئے۔ "اور میں ساری رات ایک

ٹوٹی پھوٹی قبر پہ سر نیوڑھائے سنسان رات میں اس کے لیئے وظیفہ پڑھتا رہا۔

. . . کب آئے گا وہ؟ ــــ کیا وہ لے آئے گا تمہاری ماں کو؟"

جیناں نے صرف اس قدر کہا "جی معلوم نہیں ــــ شاید آتے ہی ہوں۔

ــــ آجائیں گے ــــ اماں بھی آجائے گی ــــ پر ٹھیک پتا نہیں۔"

اتنے میں آہٹ ہوئی ــــ جیناں اٹھی۔ اس کی ماں نمودار ہوئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ موجو آیا تو اس نے مولوی صاحب کو بڑے ادب اور احترام کے ساتھ سلام کیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا "پھاتاں ــــ سلام کرو مولوی صاحب کو۔"

پھاتاں اپنی بیٹی سے الگ ہوئی۔ آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھی اور مولوی صاحب کو سلام کیا۔ مولوی صاحب نے اپنی لال لال آنکھوں سے اس کو گھور کے دیکھا اور موجو سے کہا "ساری رات قبر کے پاس تمہارے لیئے وظیفہ کرتا رہا ــــ ابھی ابھی اٹھ کے آیا ہوں ــــ اللہ نے میری سن لی ہے ــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

چوہدری موجو نے فرش پر بیٹھ کر مولوی صاحب کے پاؤں دابنے شروع کر دیئے وہ اتنا ممنون و متشکر تھا کہ کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ بیوی سے مخاطب ہو کر اس نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا "ادھر آ پھاتاں ــــ تو ہی مولوی صاحب کا شکریہ ادا کر ــــ مجھے تو نہیں آتا۔"

پھاتاں اپنے خاوند کے پاس بیٹھ گئی۔ پر وہ صرف اتنا کہہ سکی "ہم غریب

کیا ادا کر سکتے ہیں"۔

مولوی صاحب نے غور سے پھاتاں کو دیکھا" موجو چوہدری. تم ٹھیک کہتے تھے۔ تمہاری بیوی خوبصورت ہے ــــ اس عمر میں بھی جوان معلوم ہوتی ہے۔ بالکل دوسری جیناں ــــ اس سے بھی اچھی ــــ ہم سب ٹھیک کر دیں گے پھاتاں۔ ــــ اللہ کا فضل و کرم ہو گیا ہے"۔

میاں بیوی دونوں خاموش رہے۔ موجو مولوی صاحب کے پاؤں دباتا رہا۔ جیناں چولھا سلگانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب اٹھے۔ پھاتاں کے سر پہ ہاتھ سے پیار کیا اور موجو سے مخاطب ہوئے" اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے اور پھر اس کو اپنے گھر بسانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے، پھر جائز ہے"۔

موجو نے ہولے سے کہا" میں سن چکا ہوں مولوی صاحب"۔

مولوی صاحب نے موجو کو اٹھایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا" لیکن ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے غریب کو۔ اس سے بھول ہو گئی ہے ــــ آواز آئی ــــ ہم ہر روز تیری سفارشیں کب تک سنیں گے تو اپنے لیے جو بھی مانگ ہم دینے کے لیے تیار ہیں ــــ میں نے عرض کی، میرے شہنشاہ ــــ بحر و بر کے مالک ــــ میں اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا ــــ تیرا دیا میرے

پاس بہت کچھ ہے ـــ موجو چوہدری کو اپنی بیوی سے محبت ہے ـــ ارشاد ہوا ـــ تو ہم اس کی محبت اور تیرے ایمان کا امتحان لینا چاہتے ہیں ـــ ایک دن کے لئے تو اس سے نکاح کر لے۔ دوسرے دن طلاق دے کر موجو کے حوالے کر دے ـــ ہم تیرے لئے بس صرف یہی کر سکتے ہیں کہ تو نے چالیس برس دل سے ہماری عبادت کی ہے۔"

موجو بہت خوش ہوا۔ "مجھے منظور ہے مولوی صاحب ـــ مجھے منظور ہے" اور پھاتاں کی طرف اس نے تمنائی آنکھوں سے دیکھا۔ "کیوں پھاتاں؟" مگر اس نے پھاتاں کے جواب کا انتظار نہ کیا۔ "ہم دونوں کو منظور ہے۔"

مولوی صاحب نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ پڑھا۔ دونوں کے پھونک ماری اور آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ "اللہ تبارک تعالیٰ۔ ہم سب کو اس امتحان میں پورا اتارے۔" پھر وہ موجو سے مخاطب ہوئے۔ "اچھا موجو ـــ میں اب چلتا ہوں ـــ تم اور جیناں آج کی رات کہیں چلے جانا۔ صبح سویرے آجانا۔"

یہ کہہ کر مولوی صاحب چلے گئے۔

جیناں اور موجو تیار تھے۔ جب شام کو مولوی صاحب واپس آئے تو انہوں نے ان سے بہت مختصر باتیں کیں۔ وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے اشارہ کیا۔ جیناں اور موجو فوراً چلے گئے۔

مولوی صاحب نے کنڈی بند کر دی اور پھاتاں سے کہا۔ "تم آج کی رات میری بیوی ہو —— جاؤ اندر سے بستر لاؤ اور چارپائی پر بچھاؤ۔ ہم سوئیں گے۔"

پھاتاں نے اندر کوٹھڑی سے بستر لا کر چارپائی پر بڑے سلیقے سے لگا دیا مولوی صاحب نے کہا۔ "بی بی۔ تم بیٹھو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی میں چلے گئے۔ اندر دیا روشن تھا۔ کونے میں برتنوں کے منارے کے پاس ان کا گھڑا رکھا تھا۔ انہوں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ تھوڑی سی باقی تھی۔ گھڑے کے ساتھ ہی منہ لگا کر انہوں نے کئی بڑے بڑے گھونٹ پیے۔ کاندھے سے ریشمی پھولوں والا بسنتی رومال اتار کر مونچھیں اور ہونٹ صاف کئے اور دروازہ بھیڑ دیا۔

پھاتاں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ کافی دیر کے بعد مولوی صاحب نکلے۔ ان کے ہاتھ میں کٹورا تھا۔ اس میں تین دفعہ پھونک کر انہوں نے پھاتاں کو پیش کیا۔ "لو اسے پی جاؤ۔"

پھاتاں پی گئی۔ قے آنے لگی تو مولوی صاحب نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ "ٹھیک ہو جاؤ فوراً۔"

پھاتاں نے کوشش کی اور کسی قدر ٹھیک ہو گئی۔ مولوی صاحب لیٹ گئے

صبح سویرے جیناں اور موجو آئے تو انہوں نے دیکھا کہ صحن میں پھاتاں سو

رہی ہے مگر مولوی صاحب موجود نہیں۔ موجو نے سوچا۔ باہر گئے ہوں گے کھیتوں میں۔ اس نے پھاتاں کو جگایا۔ پھاتاں نے غوں غوں کر کے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ پھر بڑبڑائی "جنت ــــ جنت"۔ لیکن جب اس نے موجو کو دیکھا تو پوری آنکھیں کھول کر بستر میں بیٹھ گئی۔

موجو نے پوچھا "مولوی صاحب کہاں ہیں؟"

پھاتاں ابھی تک پورے ہوش میں نہیں تھی "مولوی صاحب ــــ کون مولوی صاحب ــــ وہ تو . . . . پتا نہیں کہاں گئے ــــ یہاں نہیں ہیں؟"

"نہیں"۔ موجو نے کہا "میں دیکھتا ہوں انہیں باہر"۔

وہ جا رہا تھا کہ اسے پھاتاں کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ پلٹ کر اس نے دیکھا۔ تکئے کے نیچے سے وہ کوئی کالی کالی چیز نکال رہی تھی ــــ جب پوری نکل آئی۔ تو اس نے کہا "یہ کیا ہے؟"

موجو نے کہا "بال"۔

پھاتاں نے بالوں کا وہ گچھا فرش پہ پھینک دیا۔ موجو نے اسے اٹھالیا اور غور سے دیکھا "داڑھی اور پٹے"۔

جیناں پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ بولی "مولوی صاحب کی داڑھی اور پٹے"

پھاتاں نے وہیں چارپائی سے کہا "ہاں ــــ مولوی صاحب کی داڑھی اور پٹے"۔

تو جو عجیب چکر میں پڑ گیا" اور مولوی صاحب کہاں ہیں؟" لیکن فوراً ہی اس کے سادہ اور بے لوث دماغ میں ایک خیال آیا" جیناں — پھاتاں، تم نہیں سمجھیں — وہ کوئی کرامات والے بزرگ تھے۔ ہمارا کام کر گئے اور یہ نشانی چھوڑ گئے۔"

اس نے ان بالوں کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور ان کو جیناں کے حوالے کر کے کہا" جاؤ، ان کو کسی صاف کپڑے میں لپیٹ کر بڑے صندوق میں رکھ دو — خدا کے حکم سے گھر میں برکت ہی برکت رہے گی۔"

جیناں اندر کوٹھڑی میں گئی تو وہ پھاتاں کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے کہنے لگا" میں اب نماز پڑھنا سیکھوں گا اور اس بزرگ کے لئے دعا کیا کروں گا جس نے ہم دونوں کو پھر سے ملا دیا۔"

پھاتاں خاموش رہی۔

[م جو رلی]

کتبہ: اقبال عبّاسی

سعادت حسن منٹو

منٹو صداقت کا علمبردار ہے ۔ اس کے ہاتھ میں دو دھاری تلوار ہے جسے وہ حکومت اور سماج کے گھنے جنگل میں انتہائی بے رحمی سے گھماتا ہے اور بناوٹ اور ریا کے پردوں کو چاک کرتا چلا جاتا ہے، اس کو گالیاں ملتی ہیں اور وہ مسکرا دیتا ہے ۔ وہ بد دعاؤں اور سزاؤں کی پرواہ کئے بغیر ایک ایسی راہ پر گامزن ہے جس پر صرف وہی چل سکتا ہے —

افسانے

لذت سنگ ۲- نمرود کی خدائی ۲- سڑک کے کنارے ۳-

ڈرامے

منٹو کے ڈرامے ۴- ؤ ۳-

نیا ادارہ : لاہور

سویرا آرٹ پریس، لا ہ